درسِ سیرت

سید عزیز الرحمن

بسم الله الرحمن الرحيم

درسِ سیرت

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

سیرت طیبہ کے دعوتی پہلو پر تریسٹھ مختلف موضوعات کے تحت ایک قیمتی مطالعہ

درسِ سیرت

(نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

سید عزیز الرحمن

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

جملہ حقوقِ بہ حق ناشر محفوظ

نام کتاب: درس سیرت
مؤلف: سید عزیز الرحمن
طبع اول: اپریل ۲۰۰۶ء
طبع دوم: مارچ ۲۰۲۰ء
صفحات: ۲۸۸

کتاب ملنے کا پتا

کتب خانہ سیرت

شاپ ۳۱۳، تیسری منزل، بک مال، اردو بازار۔ کراچی
Mobile# 0333-3114696, Whatsapp:0301-2558476
Fb.com/kutbkhanaseart

ناشر
زوار اکیڈمی پبلی کیشنز
اے۔۴/۱۸، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی۔ ۷۴۶۰۰، فون: ۳۶۶۸۴۷۹۰
info@rahet.org - www.rahet.org
zawwar academy publication
research academy for higher education & technology

فہرست

پیش گفتار		۹
اشاعت دوم		۱۲
پیش لفظ	ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری	۱۴
درسِ سیرت درسِ ایمان ہے	ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی	۱۷
مقدمہ	مولانا زاہد الراشدی	۲۱
اسوۂ حسنہ کا حقیقی امتیاز		۲۵
اسوۂ حسنہ کی ہمہ گیری اور سیرت طیبہ کا عملی پہلو		۲۹
کلام نبوت کی تاثیر		۳۷
ایمان کے تقاضے		۴۱
شعوری محبت		۴۴
محبتِ نبوی کا اظہار		۴۷
قائد کون؟		۵۰
قیادت کا امتحان		۵۴
بلند اخلاق، ایمان کی علامت		۵۸
حسن خلق		۶۳
حکمت کی برکت		۶۷
ایفائے عہد		۷۲
حسن معاملہ		۷۶
صلہ رحمی		۷۹

ایثار ۸۳
دوسروں کے کام آنا ۸۸
سچائی اور راست گفتاری ۹۲
صدق وصداقت ۹۷
سچائی کی طاقت ۱۰۰
شرم وحیا ۱۰۳
شجاعت ۱۰۹
سادگی ۱۱۴
رہن سہن ۱۱۹
خیرخواہی ۱۲۳
خوش گمانی ۱۲۸
امانت کا پاس ۱۳۱
عدل کا مفہوم ۱۳۵
وسائل کی قدر قیمت ۱۳۹
نظافتِ طبع ۱۴۲
انسان کی بڑائی ۱۴۶
یقین محکم ۱۵۰
امید کا دامن ۱۵۴
عزم واستقلال ۱۵۹
خوف خدا ۱۶۳
اعمال کی افادیت ۱۶۷
مداومت عمل ۱۷۱
کوئی نیکی چھوٹی نہیں ۱۷۵
دین کی حدود ۱۷۹
راہِ خدا میں مشقتیں ۱۸۳

تبلیغ دین	۱۸۸
سمجھانے کا طریقہ	۱۹۲
نئے امکانات کی تلاش	۱۹۶
دل کی صفائی	۲۰۰
دلوں کی نرمی	۲۰۵
افراط وتفریط کے درمیان	۲۱۰
جہالت کا مقابلہ	۲۱۴
اعراض کی ضرورت	۲۱۹
مخالفین	۲۲۳
جذبات کا معاملہ	۲۲۶
غصے کا اظہار	۲۲۹
ملامت	۲۳۵
ظالم کی مدد	۲۳۷
ملازم سے تعلق	۲۴۰
ملاقات کا ادب	۲۴۴
اپنے اپنے مقام پر	۲۴۷
اجتماعیت	۲۵۱
ہماری غذا	۲۵۶
عورتوں کی حدودِ کار	۲۶۱
حجاب کی حقیقت	۲۶۴
بچوں سے تعلق	۲۶۹
دعوت کا اسلوب	۲۷۳
خطیبوں کے لئے	۲۷۶
استقبالِ رمضان المبارک	۲۸۱
کتابیات	۲۸۶

انتساب

امت مسلمہ

کے

نام

پیشِ گفتار

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد!

قرآنِ حکیم میں جو اَبدی کتابِ ہدایت ہے، نبیٔ کریم ﷺ کے احکامات، فرامین اور اُسوۂ حسنہ سے متعلقہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۱)

اور جو کچھ تمھیں رسول (ﷺ) دیں، تم اسے لے لو اور جن چیزوں سے وہ منع کریں، اُن سے تم رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ سخت پکڑ والا ہے۔

آپ ﷺ سے متعلق یہ واضح قرآنی حکم ہم سب کے لیے راہِ ہدایت ہے، آپ کا ہر حکم ہماری ہدایت کا سبب اور دُنیاوی و اُخروی فلاح و فوز کی بنیاد ہے، یہی قرآنی حکم ہمیں حدیث میں بھی ملتا ہے۔۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا امرتکم بامر فاتوا منه ما استطعتم، و ما نهیتکم عنه فاجتنبوه (۲)

جب تمھیں میں کوئی حکم کروں تو تم جہاں تک ہو سکے اس کی تعمیل کرو، اور جب میں تمھیں کسی بات سے منع کروں تو اس سے باز آ جاؤ۔

قرآنِ حکیم ہی میں دوسرے مقام پر آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو بھی ہمارے لیے نمونہ

۱۔ الحشر: ۷

۲۔ ابن کثیر۔ التفسیر: ج ۴، ص ۳۳۶

عمل قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴿۲۱﴾ (۱)

(اے مومنو!) بے شک تمہارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ سے ملنے اور یوم آخرت کے آنے کی امید رکھتا ہے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ھذہ الایۃ الکریمۃ اصل کبیر فی التاسی برسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی اقوالہ و افعالہ واحوالہ (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ اسی صورت میں ہماری رہ نمائی کرسکتا ہے جب ہم اسے بند کتابوں سے نکال کر اپنے مطالعے کا حصہ بنائیں اور پھر دوسرے مرحلے پر اسے اپنی زندگیوں کا جز قرار دے دیں، یہ کام ہر ایک اپنے اپنے انداز میں انجام دے رہا ہے، راقم نے سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو درس کی شکل میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور ایک ایک واقعے کو ایک علیحدہ درس قرار دے کر اس کے معانی اور مفاہیم پر غور کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا ثمرہ اس کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

آج کا مسلمان بہت سے پہلوؤں سے اصلاح کا محتاج ہے، مگر اُن میں سب سے اہم پہلو اخلاق و کردار کا ہے، جس اُمت کے نبی/ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول مبارک ہی یہ ہو کہ:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق (۳)

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

اُس اُمت کے افراد اگر باہمی معاملات میں بھی ایک دوسرے کی بہ نسبت غیر مسلموں پر

۱۔ الاحزاب: ۲۱

۲۔ ابن کثیر: ج ۴، ص ۴۷۴

۳۔ امام مالک۔ المؤطا: باب حسن الخلق

زیادہ اعتماد و بھروسہ رکھتے ہوں تو اس سے بڑھ کر سانحہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کے بہت سے طریقے ہیں مگر اخلاق و کردار سے بڑھ کر کوئی طریقہ کارگر اور کارآمد نہیں، اس بات کی حقانیت کی شہادت کے لیے مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ کافی ہے، آج یہی پہلو ہم سے مزید توجہ اور مسلسل محنت کا تقاضا کر رہا ہے۔

یہ وضاحت نامناسب نہیں ہو گی کہ ان دروس کا مخاطب اول خود راقم آثم ہے، ہاں میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ مطالعۂ سیرت کے جو پہلو میری اپنی اصلاح کا سبب بن سکتے ہیں انہیں میں اپنے احباب کے سامنے بھی پیش کر دوں، تاکہ اِن دروس کے ثمرات محدود نہ رہیں اور ہر پڑھنے والے کی دست رس میں آ جائیں۔

اس چھوٹی سی کاوش کو اہلِ علم نے توقع سے بڑھ کر سراہا، میں اپنے بزرگوں محترم و مکرم جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، جناب ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی اور جناب مولانا زاہد الراشدی کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے یہ کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرمایا، راقم کی حوصلہ افزائی کی اور اپنی وقیع تحریروں سے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ فرمایا۔

جزاکم اللہ عنا جزاء حسنا

میں اپنے احباب خصوصاً ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری کا بھی شکر گزار ہوں، جن کی رہ نمائی ہمیشہ کی طرح اس کتاب کی ترتیب و تسوید میں بھی حاصل رہی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر ہمارے احوال کی اصلاح فرما دے۔ آمین

سید عزیز الرحمن

۶ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ / ۵ اپریل ۲۰۰۶ء

اشاعت دوم

سیرت طیبہ کے حوالے سے یہ کتاب اردو میں سیرت طیبہ کے عملی پہلو سمجھنے کی ایک کاوش تھی، اس کتاب میں کوشش یہ کی گئی کہ منتخب واقعاتِ سیرت کے بیان کے ساتھ ان سے حاصل ہونے والے سبق اور درس کی جانب بھی توجہ دی جائے۔ یہ کتاب پچاس عنوانات پر مشتمل تھی۔ اسے شاید اپنے موضوع کے سبب پزیرائی حاصل ہوئی، اور اساتذہ وقت نے بھی قلم کار کی حیثیت سے بڑھ کر ستائش کی۔ عرصے سے یہ کتاب نظر ثانی کی منتظر تھی، اب یہ اضافوں کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

کتاب پر نظر ثانی کرتے ہوئے خیال ہوا کہ پچاس کا عنوان کوئی مناسبت نہیں رکھتا، چناں چہ اس مجموعے میں تیرہ مزید عنوانات بڑھائے گئے ہیں۔ اس طرح اب یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کی نسبت سے اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سیرت طیبہ کے ۶۳ عنوانات پر مشتمل ہے۔

اس اشاعت کو پیش کرتے ہوئے ان چند امور کا خیال رکھا گیا ہے۔

۱۔ ایک بار مکمل پروف پڑھے گئے ہیں، اور نظر میں آنے والی اغلاط درست کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ پہلے ایڈیشن کے پچاس مضامین پر مزید تیرہ مضامین کا اضافہ موضوعات کی مناسبت سے درمیان درمیان میں کیا گیا ہے۔

نئی اشاعت کے اس مرحلے میں دو حضرات ہمارے درمیان موجود نہیں، جن کے وقیع کلمات نے اس مجموعے کو قدر و منزلت عطا کی تھی، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری اور ڈاکٹر سید ابوالخیر

کشفی دنیا سے رخصت ہو چکے۔ اللہ تعالیٰ محض سیرت کی برکت سے ان سطور کو قبول فرمائے اور انہیں ان بزرگوں کے ساتھ ہم سب کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین

بجاہ سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

سید عزیز الرحمٰن

۲۲ / جمادی الثانی ۱۴۴۱ھ / ۱۷ / فروری ۲۰۲۰ء

پیش لفظ

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری

انسان اصلاً ایک اخلاقی وجود ہے۔ اس وجود کی حفاظت، اس کی صحت کا اہتمام اور اس کے نشو و ارتقا کے لیے مسلسل کوشش اسلام کا بنیادی مقصد اور اس کی تعلیمات کا محور ہے۔ اس کے لیے ہمارے اسلاف نے تزکیۂ نفس کی قرآنی اصطلاح استعمال کی ہے، اور امت ہر سطح پر اس میں بھرپور دلچسپی لیتی رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ مثالی اخلاقی وجود کون سا ہے جس کو معیار مانا جائے اور اس سے قریب تر ہونے کے لیے سعی و جہد کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے خود رہنمائی فرماتے ہوئے ہم کو بتا دیا ہے کہ یہ مثالی وجود پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ آپ کا کردار قیامت تک مثالی اور ہر اعتبار سے اسوۂ حسنہ ہے۔ ایک انسان کو زندگی میں مختلف امتحان درپیش ہوتے ہیں، اور اُس کے لیے اپنی خاندانی، سماجی اور معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کو پیش نظر رکھنا اس لیے نہایت ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان تمام گراں بار ذمے داریوں کے معاملے میں ایک ایسا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا ہے جس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑسکتی۔ ایک مسلمان معاشرے کی یہ ایک مستقل ضرورت ہے کہ اس پہلو سے سیرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مطالعہ ہر دور میں کیا جاتا رہے اور یہ جاننے کی کوشش جاری رہے کہ آپ کی سیرت سے اخلاقیات کے باب میں ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔

سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسلمانوں کا ایک محبوب موضوع رہا ہے اور ہماری اُردو

ڈائریکٹ جنرل ادارہ تحقیقات اسلامی۔ نائب صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

زبان بھی اس سلسلے میں ایک عظیم الشان روایت کی حامل ہے جس کے تحت اصحابِ علم نے مختلف پہلوؤں سے سیرت کو اپنے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ اس سدا بہار موضوع کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ ہر دور میں ہماری تحقیق و جستجو کا مرکزی موضوع بنا رہے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے سیرت سے رہ نمائی کا یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہے۔

زیرِ نظر کتاب اس ضمن میں ایک مفید اضافہ ہے۔ اس کتاب میں اعلیٰ انسانی اخلاقیات کے تناظر میں سیرت پاک سے گوناگوں مثالیں ہمارے سامنے لا کر رکھی گئی ہیں اور اس بارے میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ انتہائی سہل، دل چسپ او، اس مقصد کے لیے نہایت موزوں ہے۔ کتاب کا ہر مضمون یا گفت گو چار پانچ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے سیرت پاک کے بے کراں سمندر میں غوطہ زن ہو کر قارئین کے سامنے ایک دو نہایت درخشاں موتی نکال کر پیش کر دیے ہیں۔ کتاب کا انداز اتنا ہلکا پھلکا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے کوئی اکتاہٹ نہیں ہوتی، نیز ہر مضمون اپنے طور پر مکمل ہے، اس لیے اس کا مطالعہ کئی نشستوں میں بھی کیا جا سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسے بار بار دہراتے رہنا چاہیے، کیوں کہ یہ کم زوری انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے کہ وہ اگر جان بھی لے تو بھی طبیعت طاعت و زہد کی طرف جلد مائل نہیں ہوتی۔ اس کم زوری کے ازالے کی واحد صورت تذکیر ہے۔

اس کتاب سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایک چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مطالعۂ سیرت کا یہ پہلو ہماری توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے، کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے اس تعلق کے قیام میں معاون ہے جو دین میں اصلاً مطلوب ہے اور یہ تعلق محبت اور عقیدت سے بھرپور اطاعت کا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اطاعت اسی وقت ممکن ہے، جب ہم یہ جانتے ہوں کہ مختلف انسانی حیثیتوں میں آپ کا اسوۂ مبارک کیا ہے۔

کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی گزارنے کی ضرورت کے دوگونہ پہلو یک ساں طور پر سامنے آتے ہیں۔ مسلمان کی زندگی ان ہی دونوں سے عبارت ہے۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے گزشتہ صدی کے مشہور شاعر ماہر القادری مرحوم یاد آ جاتے ہیں، جن کی شاعری عشق

رسول میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُن کا یہ شعر خاص طور پر یاد آیا اور بہت حسب حال محسوس ہوا:

کام بے کار ہیں سب اُن کی محبت کے سوا
اور بے کار محبت ہے اطاعت کے بغیر

میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب ہمارے اخلاقی وجود کی حفاظت اور ارتقا میں مفید ثابت ہوگی۔ سیّد عزیز الرحمن صاحب جو نوعمر ہونے کے باوجود علمی تبحر اور تحریر کی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ ور ہیں، اس نہایت مفید تصنیف پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور ان کے اس کام کو مفید تر اور عظیم تر کاموں کا پیش خیمہ بنائے۔

ظفر اسحاق انصاری

درسِ سیرت درسِ ایمان ہے

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

آج سے کوئی تیس پینتیس سال پہلے سینٹ مائیکل اسکول میں سیرت کا ایک جلسہ تھا۔ اسکول کے پرنسپل نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج پاکستان بنے ہوئے تینتیس سال گزر گئے، اگر پاکستانی مسلمانوں نے ہر سال اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاقِ حسنہ میں سے کسی ایک اخلاق کو اپنایا ہوتا تو پاکستان کی وہ صورت نہ ہوتی جو آج ہے، اور یہ کہتے ہوئے اُس نے سیرت النبی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کے عنوانات بتانا شروع کر دیے۔ یہ گزرا ہوا واقعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے، اور آج پاکستان کے برے حالات کو دیکھ کر میں بھی یہی سوچنے لگتا ہوں۔

آج باتیں معاشی خوش حالی اور تجارت کے فروغ کی ہو رہی ہیں، اور ان سرگرمیوں پر میرا تبصرہ صرف اتنا ہے کہ:

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

ہم اصل میں اخلاق کے بحران سے گزر رہے ہیں، ہمارے حالات کم و بیش ویسے ہی ہیں جیسے عہدِ مغلیہ کے زوال کے وقت تھے۔ باہمی اختلافات، قبر پرستی، نواہی و منکرات کے ارتکاب پر افسردہ نہیں بل کہ بعض حالات میں فخر کا اظہار، اور یہ سب کچھ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت اور اخلاق سے دوری کا سبب ہے، میری ناچیز رائے میں یہ وقت اسلام پر دقیق علمی مباحث کا نہیں ہے، بل کہ ہمارے اہلِ قلم کو اس بات کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ دلوں میں اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جوت پیدا ہو سکے۔

ہمارے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقِ حیات سے دوری کے سبب مر چکے ہیں اور اب احیائے فرد و ملت کا ایک ہی راستہ ہے:

دل مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
اقبال

الحمدللہ، سید عزیز الرحمن نے نوعمری ہی میں اپنے ذہن، اپنی فکر اور اپنے قلم کو اذکارِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے وقف کر دیا ہے، یہ اُن کے ایمان کی شہادت بھی ہے، اور شجرۂ نسب کی دستاویز بھی۔

حضرت مولانا سید زوّار حسین شاہ کی تحریروں کی روح اتباعِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلقین ہے۔ سید فضل الرحمن نے ہادیٔ اعظم اور فرہنگِ سیرت کی صورت میں سیرت کے ادب میں نئی جہات پیدا کی ہیں، اور سید عزیز الرحمن نے آج کے محاورے اور زبان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذات و اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کتنے ہی گوشوں کو پیش کیا ہے۔ خاندان اور بالخصوص عزیز الرحمن صاحب بہ جا طور پر کہہ سکتے ہیں:

تیسری پشت ہے سرکار کی مداحی میں

عصری زندگی میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اگرچہ زینتِ محراب و منبر تک محدود ہے، لیکن بعض تقریبات کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ سیرت کے ادب میں تنوع اور وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ ان تقریبات میں قومی سیرت کانفرنس بھی شامل ہے، اس کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کے لیے عزیز الرحمن صاحب نے جو مقالات لکھے، اور جن پر انہیں اعزازات بھی ملے، وہ ''تعلیماتِ نبویؐ اور آج کے زندہ مسائل'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

اب سے قیامت تک کا زمانہ عہدِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام ہے:

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا وہ لاکھوں کا سہی
اب سے تا حشر جو فردا ہے وہ تنہا تیرا
احمد ندیم قاسمی

عزیز الرحمن صاحب کے ان مضامین کا حوالہ ہم سب کی زندگی ہے، اور اُن سے یہ

حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام اور اُس کی تعلیمات صرف ہر عہد کے مطابق نہیں، بل کہ ہر عہد سے آگے ہیں۔ اگر ہم ان تعلیمات کو اپنالیں تو اقوامِ عالم کی قیادت ہمارا منصب نہیں بل کہ فریضہ ہو جائے گی۔

سید عزیز الرحمن صاحب کی نئی تصنیف ''درس سیرت'' اسی سلسلۃ الذہب کی حالیہ کڑی ہے، خدا کرے یہ سلسلہ جاری رہے۔ یہ پچاس مختصر مضامین کا مجموعہ ہے، جنھیں پچاس درس قرار دیا جاسکتا ہے، اگر ہر دن ایک درس پڑھا جائے اور اس پر غور کیا جائے تو پڑھنے والے کی فکر اور عمل کی کتنی ہی راہیں روشن ہو جائیں گی۔ ان مضامین کا حسن ان کے اختصار اور زبان میں پوشیدہ ہے۔ نبیٔ اکرم کا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قول ہے:

نماز کی طوالت اور خطبے کا اختصار انسان کے تفقہ کا دلیل ہے۔(۱)

جو لوگ تحریر و تقریر کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ الفاظ خطیب یا مصنف کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، اور اس حد تک کہ معانی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، سید عزیز الرحمن نے فصاحت و بلاغتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تحقیقی کام کیا ہے، اور وہ جانتے ہیں کہ مسجع، قافیہ بندی اور آرائش میں گوہرِ مدعا کو گم نہیں ہونا چاہیے کہ یہی سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

سید عزیز الرحمن کا اسلوب فطری اور اُن کی افتادِ طبع کے مطابق ہے، اپنے اوپر قیاس کرتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ اس اسلوب کی پرداخت میں اُن کا کچھ حصہ نہیں، یہ عطیۂ خداوندی ہے، اس کی تفہیم میں کہیں کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جن محاسنِ اخلاق کا ان مضامین میں ذکر ہے، وہ دراصل اخلاقی صفات ہیں، یا انہیں آپ زندگی کے مواقع قرار دے سکتے ہیں، ہر موقع پر مسلمان کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے، وہ ان مضامین سے ہمارے سامنے آتا ہے، اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان:

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

ہے۔ یہ اخلاقی صفات انسان کو زندہ کرامت بنا دیتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کا تتبع مسلمان کو انسانیت کے لیے فصلِ بہار بنا دیتی ہے۔

۱۔ مستدرک: ج ۳، ص ۴۴۴، رقم ۵۶۸۳

عزیز الرحمن صاحب نے اخلاقِ حمیدہ کے علاوہ آداب کو بھی ان دروس میں شامل کیا ہے، مثلاً ''ملاقات کا ادب''، ''دعوت کا اسلوب''، اور ''خطیبوں کے لیے'' وغیرہ۔

یہ آداب بے حد ضروری ہیں، ادب کے بغیر اسلام بھی زندیقی بن جاتا ہے، قرآن مجید میں اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادب پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اس ادب کو ملحوظ نہ رکھنے سے انسان کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب اخلاق محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سمجھنے سمجھانے کا ایک روشن دریچہ ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو لوگ ذوق وشوق سے پڑھیں۔ اس سے ان کے کردار میں تجلیاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عکس پیدا ہو اور ہمارا معاشرہ اللہ کے نور سے جگمگا اُٹھے۔ آمین

سید محمد ابوالخیر کشفی

مقدمہ

مولانا زاہد الرشدی

ڈائریکٹر الشریعۃ اکادمی، گوجرانوالہ

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی وسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ وأصحابہ وأتباعہ اجمعین

سرورِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی انسانی تاریخ کی وہ عظیم شخصیت ہے جن پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے اور جن کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف گوشوں پر ہر دور میں قلم اُٹھایا گیا، مگر اس کے باوجود سیرتِ طیبہ کا موضوع ہمیشہ سے تشنہ ہے اور ہمیشہ تشنہ رہے گا۔

چوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ پوری نسلِ انسانی کے لیے قیامت کے لیے آئیڈیل اور انسانی معاشرے میں فرد، خاندان، قوم اور عالمیت کے ہر دائرے کی جزئیات اور نفسیات تہہ در تہہ اور پیچ در پیچ ہیں، اس لیے جوں جوں یہ تہیں کھلتی جائیں گی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کے نت نئے پہلو وقت کی ضروریات کے ساتھ اُجاگر ہوتے رہیں گے اور یہی سیرتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا سب سے بڑا اعجاز ہے۔

اجتماعیت، قومیت اور خاندان کے دائروں میں اصولی رہ نمائی کے ساتھ ساتھ ایک فرد کی زندگی کی جزئیات تک میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ نسلِ انسانی کی ایسی جامع اور کامل رہ نمائی کرتی ہے کہ کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، قرنِ

اول کے ایک مسلمان دانش ور سے کسی غیر مسلم نے بہ طورِ تعریض یہ بات کہی تھی کہ آپ کے پیغمبر تو پیشاب پاخانے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اس مسلمان دانش ور نے جواب میں کہا کہ جس بات کو تم اعتراض کے طور پر پیش کر رہے ہو، وہی تو سیرتِ طیبہ کا سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے بھی اپنے پیروکاروں کو کسی اور طرف دیکھنے کا محتاج نہیں رہنے دیتی۔

اسی حوالے سے بہ ظاہر ایک چھوٹی سی بات پر نظر ڈال لیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا:

دو، لعنت کا مستحق بنانے والے کاموں سے بچو، ایک یہ کہ عام لوگوں کی گزرگاہ میں پیشاب پاخانہ نہ کرو اور دوسرا یہ کہ سائے والی کسی جگہ میں ایسی حرکت کرو۔

بہ ظاہر یہ چھوٹی سی اور جزوی سی بات ہے لیکن اس کے پیچھے اسلام کا یہ عظیم اُصول اور فلسفہ کار فرما ہے کہ کسی بھی ایسے کام سے گریز کرنا چاہیے جو دوسرے لوگوں کے لیے کسی درجے میں اذیت یا تکلیف کا باعث بن سکتا ہو، بل کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی اذیتوں سے بچانے کے عمل کو ایمان کے شعبوں میں شمار کیا ہے، چناں چہ ارشادِ نبوی ہے:

الایمان بضع و سبعون، او بضع و ستون شعبة، فافضلها قول لا اله الا الله، و ادناها اماطة الاذی عن الطریق و الحیاء شعبة من الایمان (۱)

ایمان کے ستر سے کچھ اوپر شعبے ہیں، جن میں سب سے اعلیٰ درجہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی شہادت اور سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی راستے میں پڑی ہوئی کوئی ایسی چیز وہاں سے ہٹا دے جو گزرنے والوں کے لیے اذیت کا باعث بن سکتی ہو اور حیا بھی ایمان کا شعبہ ہے۔

انسانوں کے باہمی تعلقات، میل جول، معاملات اور ربط و مفاہمت میں ایک دوسرے

۱۔ مسلم: ج۱، ص۷۱، رقم ۳۵

کی ضروریات کا خیال رکھنا، باہمی ادب واحترام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا، ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھنا اور دوسروں کو ترجیح دینا اخلاقیات کے اہم ترین پہلو ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرما کر خود کو اخلاقیات کے پیغمبر کے طور پر پیش کیا ہے:

بعثت لأتمم مکارم الأخلاق

میں اخلاقیات کی خوبیوں کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

اور امر واقعہ یہ ہے کہ اخلاقیات کی خوبیوں کو جس گہرائی میں جا کر جنابِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُجاگر کیا ہے کسی اور جگہ اس کی مثال نہیں ملتی، سیرتِ طیبہ کے بے شمار واقعات اس حوالے سے پیش کیے جاسکتے ہیں مگر نمونے کے طور پر صرف ایک واقعے کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، آپ کے دائیں طرف ایک نوجوان حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے تھے، جن کی عمر اس وقت بہ مشکل تیرہ چودہ برس ہوگی جب کہ دوسری طرف حضرت صدیقِ اکبرؓ اور دیگر بزرگ صحابہؓ تشریف فرما تھے، اس موقع پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک مشروب پیش کیا گیا جو آپ نے نوش فرمایا اور باقی ماندہ بائیں طرف بیٹھے ہوئے کسی بزرگ کو دینا چاہا، لیکن دائیں جانب بیٹھے ہوئے ہونے کی وجہ سے حق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بنتا تھا، اس لیے ان سے باقاعدہ اجازت مانگی کہ حق تمہارا بنتا ہے لیکن اگر تم اجازت دو تو یہ پیالہ بائیں طرف بیٹھے بزرگ کو دے دوں؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں آپ کے تبرک کے بارے میں کسی اور کو خود پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ روایت میں ہے کہ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیالہ عبداللہ بن عباسؓ کو زور سے تھما دیا، اس تھما دینے کے لفظ میں کچھ خفگی کا پہلو بھی نظر آتا ہے مگر اس سب کچھ کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باہمی حقوق کی جو تشریح خود فرمائی ہے اس کی خلاف ورزی کی نوبت نہیں آنے دی۔

اس طرح کے واقعات جو بہ ظاہر چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں، سیرتِ طیبہ میں جا بہ جا نظر آئیں گے اور یہی سیرتِ طیبہ کی جامعیت اور گہرائی کا عنوان ہیں۔

ہمارے فاضل دوست مولانا سید عزیز الرحمن نے زیرِ نظر کتاب ''درسِ سیرت'' میں جو

اُن کے اس حوالے سے خوب صورت اور معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ہی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے اور ہماری عملی اور معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے والے سبق آموز واقعات اور ارشادات کا انتخاب پیش کیا ہے۔ آج کے دور میں اسی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اس لیے کہ ہمارے ہاں عام طور پر روزمرہ کی عملی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات وتعلیمات کی طرف اس قدر توجہ نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے، جب کہ میری طالب علمانہ رائے میں آج کے دور میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کرنے کی ترجیحات میں دو باتوں کو اولین درجہ حاصل ہونا چاہیے کہ

☆ عصرِ نو کے جدید علمی وفکری مسائل بالخصوص بالادست مغربی فکر وفلسفے کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا سیرتِ نبوی اور اُسوۂ خلفائے راشدینؓ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور

☆ روزمرہ کی عملی اور معاشرتی زندگی کے بہ ظاہر چھوٹے چھوٹے مسائل اور باہمی رویوں اور تعلقات کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات وحالات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے اور انہیں اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے کیوں کہ ہم معاشرتی طور پر اخلاقیات کے جس خوف ناک بحران کا شکار ہیں، اس سے نجات کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اس پس منظر میں مولانا سید عزیز الرحمن کی یہ کاوش اس سمت میں ایک مفید پیش رفت ہے۔ اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نفع بخش بنائیں۔ آمین یارب العالمین۔

ابوعمار زاہد الراشدی

۱۱ رمحرم الحرام ۱۴۲۷ھ

اسوۂ حسنہ کا حقیقی امتیاز

نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور حیاتِ طیبہ کا ایک ایک جز اپنے اپنے مقام پر اس قدر وسعت، معنوی بلندی، گہرائی و گیرائی اور اس قدر کمال رکھتا ہے کہ وہ بہ ذاتِ خود ایک کل کی مانند نظر آتا ہے، اور اپنی خوبیوں اور برکتوں کے اعتبار سے وہ دیگر بہت سی خوبیوں پر اتنی فوقیت رکھتا ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک جز کے چراغ میں نہ جانے کتنے ہی آفتاب و ماہتاب گم ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ مکمل طور پر عمل کی معنویت سے آراستہ ہے، اور اس کا صحیح معنی میں امتیاز یہی ہے کہ اس میں کسی قسم کا ابہام و اشکال وارد نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ کی تعلیمات کاغذی پھولوں کی طرح نہیں، جن کی خوش بو تخیل و تصور کی محتاج ہو، نہ وہ کتابی فلسفے کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کے ثبوت کے لیے دلائل کی تلاش ضروری ہو، بل کہ وہ معروضی حقائق سے بہ راہِ راست متعلق ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کسی بھی پہلو سے کوئی بھی بات شرح و تشریح کی محتاج نہیں، وہ تو اپنی شرح خود آپ ہے۔

مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ غصہ نہ کرو، چناں چہ فرمایا:

لیس الشدید بالصرعة، انما الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب(۱)

طاقت ور وہ نہیں جو مد مقابل کو پچھاڑ دے، بل کہ طاقت ور وہ ہے جو غصے کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے۔

۱۔ بخاری: کتاب الادب، باب الحذر من الغضب

اب ایک عام شخص کے لیے یہ قول اس وقت تک دلیل نہیں بن سکتا، جب تک اس کے سامنے صاحب قول کا اپنا اسوہ نہ ہو، ورنہ اچھی باتوں کی تلقین تو کوئی بھی کر سکتا ہے اور ہمارے معاشرے میں تو دوسروں کو نصیحت کرنا سب سے آسان اور سستا کام ہے، مگر جب اس ہدایت کے سننے کے بعد ہمارے سامنے یہ امر آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا عمل خود اس کے بالکل مطابق تھا تو عمل کی راہ ہمارے لیے خود بہ خود سہل اور آسان ہو جاتی ہے۔ غزوہ احد میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زخمی ہو گئے، آپ کے دندان مبارک بھی شہید ہوئے، اس وقت صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ کفار کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بددعا فرمائیے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت یہی فرمایا کہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، بل کہ مجھے تو ہادی و رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہے، اور پھر بددعا کی بہ جائے ان کے لیے دعا فرمائی:

اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون (۱)

اے اللہ! میری قوم کو ہدایت نصیب فرما، کیوں کہ یہ مجھے جانتی نہیں۔

اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفو اور معاف کرنے کی تلقین کی، تو ساتھ ساتھ اپنا اسوہ بھی پیش فرما دیا۔ ورنہ آج کے ترقی یافتہ دور میں جب کہ امن کے نام پر پوری کائنات کو تہس نہس کیا جا سکتا ہو، ایسا کون شخص ہوتا، جو انتقام اور انتقامی کارروائیوں کی مخالفت کرتا؟ مگر ہادی برحق رحمت عالم نے پہلے تو ایک جانب عفو و درگزر کی تلقین کی، اور پھر اپنا عمل بھی نمونۂ عمل بنا کر اقوامِ عالم کے سامنے پیش فرما دیا۔

چناں چہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جانب تو اپنی جان کے دشمنوں اور اپنے عزیز ترین ساتھیوں اور قریب ترین رشتہ داروں کے قاتلوں تک کو یہ کہہ کر پروانۂ معافی بخش دیا:

لا تثریب علیکم الیوم، اذہبوا فانتم الطلقاء (۲)

اور پھر فوراً ہی مجمع عام میں یہ اعلان بھی فرما دیا:

۱۔ قاضی عیاض۔ الشفاء: ج ۱ ص ۶۱

۲۔ الشفاء: ج ۱ ص ۶۴

الا وان کل دم و مال و ماثرۃ کانت فی الجاہلیۃ تحت قدمی ہذہ الی یوم القیامۃ، وان اول دم یوضع دم ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب (۱)

آگاہ ہو جاؤ کہ بلا شبہ دور جاہلیت کا ہر خون اور مال و منصب سب قیامت تک کے لیے میرے پاؤں تلے پامال ہے۔ اور پہلا خون جو میں اپنے خونوں میں سے معاف کرتا ہوں، وہ ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا خون ہے۔

اس طرح اب کوئی اس ہدایت کی معروضیت کے بارے میں انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔

پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال داروں کو یہ ہدایت فرمائی، فرمایا:

انفقی و لا تحصی، فیحصی اللہ علیک (۲)

مال خرچ کرو اور گن گن کر نہ رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں گن گن کر دینے لگے۔

تو اپنے اس حکم میں معروضیت پیدا کرتے ہوئے اسے اپنے عمل سے آراستہ بھی کر دکھایا، خود کبھی مال سنبھال کر نہیں رکھا، بل کہ مال کو اللہ کی راہ میں لٹانے کا جذبہ اس قدر وقیع ہوتا تھا کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند درہم بھی رات بھر اپنے پاس رکھنا گوارا نہ کیے، ایک بار صرف دو اشرفیاں پاس بچیں، تو اس کے خیال سے رات بھر نیند نہیں آئی، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا کہ یہ تو معمولی بات ہے، صبح خیرات کر دیجیے گا، تو فرمایا:

کیا خبر صبح تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔ (۳)

ایک بار خلافِ معمول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصر کی نماز کے بعد فوراً اپنے حجرے میں تشریف لے گئے، اور پھر فوراً ہی واپس تشریف لے آئے، صحابہ کرامؓ کو تعجب ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ احمد۔ المسند: ج ۶، ص ۶۹۔ رقم ۲۰۱۷۲

۲۔ مسلم: ج ۲، ص ۱۰۲۔ رقم ۱۰۲۹۔ بخاری: کتاب الزکاۃ، باب ۲۱

۳۔ مشکوۃ شریف

ذکرت شیئا من تبر عندنا، فکرہت ان یحبسنی، فامرت بقسمتہ (۱)
مجھے (دورانِ نماز) خیال آیا کہ گھر میں کچھ سونا پڑا رہ گیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے، اس لیے گھر جا کر اسے خیرات کرنے کے لیے کہہ آیا ہوں۔

ایک جانب آپ ﷺ کی سخاوت کا یہ عالم تھا، اور دوسری جانب آپ ﷺ نے ایک اور بات بیان فرمائی، آپ نے فرمایا:

ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جس میں درہم و دینار کے سوا کوئی چیز فائدہ مند نہ ہوگی۔

اس سے صحابہ کرامؓ نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ ضرورت کے بہ قدر مال جمع کر لینا چاہیے، تاکہ ضرورت میں کام آسکے، چناں چہ حضرت مقدام بن معدیکربؓ نے اس سے یہی مفہوم سمجھا۔(۲)

اس طرح آں حضور ﷺ نے کس خوبی و جامعیت سے معاشرت و معیشت کے یہ مختلف الجہت پہلو جمع فرما دیے۔ سخاوت، اعتدال، مصلحت پسندی و منصوبہ بندی سب ہی کا خلاصہ آپ ﷺ نے پیش فرما دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی یہی وہ خوبی ہے، جو اسے ہمہ گیریت عطا کرتی ہے، اور جو علم و عمل میں ہم آہنگ پیدا کرتی ہوئی ذہنوں کو بہ راہِ راست متاثر کرتی ہے، اور قلوب و اذہان میں جاگزیں ہو کر پیغامِ سیرت پر عمل پیرا ہونے کی تحریک پیدا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سیرت طیبہ کی ضیا پاش کرنوں سے استفادہ کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین۔

۱۔ بخاری: کتاب الاذان، باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ

۲۔ مسند احمد: ج ۵، ص ۱۲۰

اسوۂ حسنہ کی ہمہ گیری اور سیرت طیبہ کا عملی پہلو

اس دنیا کا آغاز ہزاروں سال پہلے تصور کیا جائے یا لاکھوں اور کروڑوں برس قبل، اس وقت سے لے کر آج تک جتنے بھی برگزیدہ، نمایاں ہستیوں کے مالک، قائدانہ صلاحیتوں کے حامل، کسی بھی اعتبار سے ممتاز نظر آنے والے جتنے بھی لوگ آئے ہیں سب ہی کے بارے میں کسی نہ کسی گروہ میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی فلاں حیثیت میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔

لیکن اگر بات حقائق کی ہو رہی ہو، اور دلائل کے طور پر ہر شخص کی زندگی کی ہمہ جہتی، عالم گیریت، جامعیت اور کمال اور عملیت کو پیش کیا جائے تو پھر دنیا کے اپنے اپنے دور کے تمام بڑے انسان، تاریخ انسانیت کے سب سے بڑے، سب سے کامل ہر لحاظ سے اکمل و مکمل انسان ہادی عالم، ہادی اعظم، ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ اس قدر بدیہی، واضح اور اٹل حقیقت ہے کہ اس پر کسی دلیل کا مطالبہ تک نہیں کیا جاسکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خود ایک زندہ جاوید شہادت اور روشن ترین دلیل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ کی جامعیت اور کمال دلائل و براہین کا محتاج نہیں، یہ حقیقت ہر لحاظ سے تسلیم شدہ اور ہمارے ایمان کا جز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۱)

۱۔ الاحزاب: ۲۱

(اے مومنو!) بلاشبہ تمہارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

یہ قول علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت مبارکہ میں اسوۂ حسنہ کی پیروی کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور یہ آیت اس امر کی بہت بڑی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال افعال واحوال کی پیروی اور اقتدا نہایت ضروری ہے۔(۱)

جس کسی کو مقتدا اور رہبر تسلیم کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس شخصیت کے جملہ کوائف ہمارے سامنے ہوں، پھر جب اس شخصیت کی تاریخی حیثیت واضح ہو جائے تو اس کی جامعیت، ہمہ جہتی اور کمال کے بارے میں انسان کی متجس فطرت سوالات کرتی ہے۔ اور جب یہ اقتدا اور رہبری انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط اور کارہائے زیست کے ایک ایک جز پر حاوی ہو تو اس کامل کے بھی کمال کا متلاشی ہونا ضرورت بن جاتا ہے۔

یہ وہ کسوٹی ہے جہاں دنیائے انسانیت کا بڑے سے بڑا قائد، بڑے سے بڑا رہنما اور بڑی سے بڑی شخصیت لڑکھڑا سکتی ہے۔ اور یہی وہ مسند ہے جس پر متمکن ہونے کا شرف قسام ازل نے ابتدائے آفرینش سے اگر کسی طبقے کے مقدر کیا ہے تو وہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا ہی طبقہ ہے۔ اور پھر اس طبقے کی بھی سرداری اور امامت امام الانبیا علیہ الصلاۃ والسلام کے حصے میں آئی، چناں چہ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ جامعیت اور کمال اور ہر مقام پر وہ اعتدال نظر آتا ہے کہ اس اعتدال کا توازن کے ساتھ برقرار رہنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل بل کہ معجزہ بن کر سامنے آتا ہے۔

انسانی مزاج کا یہ خاصہ ہے کہ جب کسی شعبۂ زندگی میں قدم رکھتا ہے تو فطری طور پر وہ اس امر کا خواہاں ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اس شعبے کا ایسا کامل اور مثالی نمونہ موجود ہو جسے دیکھ کر وہ اپنے لیے راہِ عمل متعین کر سکے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا کمال یہ ہے کہ دنیا کا ہر فرد اپنی حیثیت کے

۱۔ تفسیر ابن کثیر: ج ۳، ص ۴۷۴

مطابق آپ ﷺ کی حیات طیبہ سے روشنی حاصل کر کے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے، اور دین و دنیا کی بھلائیاں کام یابیاں اور کام رانیاں اپنے دامن میں سمیٹ سکتا ہے؛ اس لیے کہ زندگی کے ہر شعبے، حیات انسانی کے ہر موضوع، اخلاق و آداب کے ہر پہلو اور اصول و قوانین کے تمام بنیادی اسباق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نظر آتے ہیں۔(۱)

ذیل میں اسی کے چند نمونے تبرکاً پیش کیے جائیں گے۔

دراصل انسانی فطرت یہ ہے کہ اس کو نصیحت کے الفاظ سے زیادہ ناصح کا اپنا عمل متاثر کرتا ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کام یابی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ آپ ﷺ کی بارگاہ سے سائل کو درس بعد میں ملتا تھا اس درس کی عملی کیفیت اس کے سامنے پہلے آجاتی تھی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ہمیں جو عظیم الشان مگر حیرت انگیز انقلاب نظر آتا ہے اس میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی عملیت کارفرما ہے، ایک صحابی رسول کے سوال پر جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا:

کان خلقه القرآن (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق تو قرآن ہے۔

تو مفہوم یہی تھا کہ اگر تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ اور انداز حکیمانہ کو جاننے کے خواہش مند ہو تو قرآن کریم پر نظر ڈالو اور اس کا مطالعہ کرو، کیوں کہ قرآن اور صاحب قرآن ایک ہی سرمدی صداقت کے دو رخ ہیں۔ جسے یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ایک علم ہے تو دوسرا عمل، یا ایک آفتاب ہدایت ہے تو دوسری اس آفتاب کی ضیا پاشی کرتی ہوئی تجلی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی ہماری عملی زندگی میں اہمیت یہی ہے کہ وہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے۔ اور اسی بنا پر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وانا له لحافظون (۳) فرما کر

۱۔ ہادیٔ اعظم۔ سید فضل الرحمن: ص ۵۱۵

۲۔ طبقات ابن سعد: ج ۱، ص ۱۷۵

۳۔ الحجر: ۹

جب خالق ارض وسما نے کتاب ہدایت قرآن حکیم کی حفاظت کی ضمانت دی تھی تو اس میں اسوۂ حسنہ اور سنت نبوی کے قیام و بقا کا پہلو بھی شامل تھا، کیوں کہ یہ قرآن سے الگ ہونے کے باوجود بعینہ اسی طرح اس سے تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ شرح کا متن سے ایک خصوصی ربط و اتصال ہوتا ہے، ایسا ربط و اتصال کہ متن کے بغیر شرح کا اپنا وجود بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا عملی درس یہ ہے کہ کسی بھی معاملے کے تمام فریق اپنی اپنی حدود کی بھرپور رعایت کریں، آپ ﷺ نے جہاں ایک طرف والدین کے بارے میں فرمایا:

ما نحل والد ولدا من نحل افضل من ادب حسن (۱)

کوئی والد اپنے بچے کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی طرح تعلیم دے۔

اور اولاد کو برابر کی توجہ دینے کا حکم فرمایا (۲) تو دوسری جانب اولاد کو بھی والدین کا مقام پہچاننے، ان کی اطاعت کرنے اور ان کی نافرمانی سے بچنے کی ترغیب دی، فرمایا:

ان اللہ حرم علیکم عقوق الامہات (۳)

اللہ تعالیٰ نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔

اور دوسری روایت میں والدین کی خدمت کو جہاد کا درجہ عطا فرمایا۔ (۴) اس طرح اہل قرابت سے تعلقات کے بارے میں ایک طرف تو یہ فرمایا گیا کہ صلہ رحمی نہ کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (۵) اور دوسری طرف خونی تعلقات ختم کرنے والوں کے عزیز و اقارب کو یہ کہہ کر ردعمل میں تعلقات ختم کرنے سے باز رکھا کہ

۱۔ ترمذی: ج ۳، ص ۳۸۳، رقم ۱۹۵۹

۲۔ بخاری: کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات

۳۔ بخاری: کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر

۴۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۶۳، رقم ۲۵۴۹

۵۔ بخاری: کتاب الادب، باب اثم القاطع

صل من قطعک واعط من حرمک واعرض عمن ظلمک (۱)

جو تم سے توڑے، تم اس سے جوڑو اور جو تمھیں محروم کرے تم اسے دو، اور جو تم پر ظلم کرے، تم اس سے اعراض کرو۔

نبی اکرم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی یہ ہمہ جہتی اور آپ کی تعلیمات کا یہ تنوع ہر پہلو سے نمایاں ہے، جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیمی معاملات میں ہدایات جاری فرماتے ہیں تو سب سے پہلے اساتذہ کے طبقے کو فرمایا جاتا ہے:

تعلموا العلم وعلموہ الناس (۲)

علم سیکھو اور اسے لوگوں تک پہنچاؤ۔

اور علما کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم (۳)

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر۔

اور علم چھپانے پر وعید سنائی کہ ایسے شخص کو روزِ محشر آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ (۴) اور اس کے ساتھ ساتھ طالب علم کو بھی اس کا مقام بتایا، اس کے لیے سب سے پہلی ہدایت یہ فرمائی کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (۵) اور یہ بشارت بیان فرمائی کہ جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے کوئی راستہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ (۶) اور پھر طلبہ اور تمام چھوٹوں کو اپنے بڑوں کی عزت و تکریم کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

۱۔ مسند احمد: ج ۵، ص ۱۴۳، رقم ۱۶۸۸۳

۲۔ دارمی: ج ۱، ص ۸۴، رقم ۲۲۱

۳۔ دارمی: ج ۱، ص ۱۰۰، رقم ۲۸۹

۴۔ دارمی: ج ۱، ص ۱۴۵، رقم ۵۴۲

۵۔ ابن ماجہ: ج ۱، ص ۹۷، رقم ۲۲۴

۶۔ مستدرک: ج ۱، ص ۱۶۵

لیس منامن لم یرحم صغیرنا ویوقر کبیرنا ویامر بالمعروف وینہ عن المنکر (۱)

جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کا احترام نہیں کرتا اور نیکیوں کا حکم نہیں کرتا، اور برائیوں سے منع نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں۔

اسی طرح انہیں یہ تاکید بھی کی کہ ان کا حصول علم محض اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کے لیے ہونا چاہئے اور یہ بھی فرمایا کہ اگر علم کے ساتھ عمل نہیں ہوگا، تو یہ اپنے علم کے ساتھ ناانصافی ہے، اور فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے برا شخص وہ عالم ہوگا جس نے اپنے علم سے نفع نہیں اٹھایا۔(۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا کمال، جامعیت اور ہمہ جہتی صرف چند امور میں نہیں، ہر شعبہ زندگی کے بارے میں دی گئی ہدایات میں یہ جامعیت نمایاں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جانب آجر کو یہ فرماتے ہیں:

اعط الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (۳)

مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کردو۔

وہیں مزدور کے بارے میں فرمایا کہ بہترین کمائی ہاتھ کی کمائی ہے، جب کہ وہ خیرخواہی کرے گا۔(۴) اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدور کی کمائی کو خیرخواہی کے ساتھ مشروط کردیا، تاکہ آجر اور مالک کے حقوق کی بھی نگہ بانی ہوسکے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جانب میزبان کو فرمایا:

من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ جائزتہ (۵)

۱۔ترمذی: ج ۳، ص ۳۰۷، رقم ۱۹۲۸

۲۔مشکوۃ کتاب العلم

۳۔بیہقی۔السنن الکبریٰ: ج ۹، ص ۲۴۲، رقم ۱۱۸۶۳

۴۔مسند احمد: ج ۲، ص ۳۳۹، رقم ۸۲۰۷

۵۔ترمذی: ج ۳، ص ۳۸۹، رقم ۱۹۷۴

جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

دوسری جانب مہمان کو بھی تنبیہ فرمادی:

الضیافة ثلاثة ایام، وما کان بعد ذلک فهو صدقة (۱)

مہمانی تین دن کی ہے، اس کے بعد مہمان پر صدقہ ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ اور امت کے سامنے پیش کردہ اسوۂ حسنہ میں انسان کو اس کے نفس کے حقوق کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے اور اس کے حقوق کا خیال رکھنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت میں مسلسل شب بیداری اور نفلی روزوں میں اس قدر زیادتی سے بھی منع فرمایا، جس سے اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی متاثر ہو اور دیگر معاملات میں بھی خلل واقع ہو۔ فرمایا:

فان لجسدک علیک حقا، وان لعینک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا (۲)

تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔

اسی طرح آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے بھی ایک دوسرے پر حقوق واضح کیے ہیں ایک روایت میں فرمایا:

المؤمن مرآة المؤمن، والمؤمن اخو المؤمن یکف علیه ضیعته ویحوطه من ورائه (۳)

مؤمن مؤمن کا آئینہ ہے اور مؤمن مؤمن کا بھائی ہے، وہ نقصان دہ چیز سے بچتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔

۱۔ ترمذی: ج ۳، ص ۳۸۹، رقم ۱۹۶۴

۲۔ بخاری: کتاب الصیام، باب حق الجسم فی الصوم

۳۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۳۰۴، رقم ۴۹۱۸

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تمار اخاک ولا تمازحه ولا تعده موعدة فتخلفه (۱)

اپنے بھائیوں سے (خواہ مخواہ) بحث نہیں کیا کرو اور نہ اس سے ایسی دل لگی کرو کہ جو اسے ناگوار ہو، نہ اس سے کوئی وعدہ کرو جو تم پورا نہ کرسکو۔

اسی طرح ہمارے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوۂ حسنہ آتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ ہر اعتبار سے جامعیت کا شاہ کار ہے، بل کہ وہ عملی طور پر ہمیں دعوت عمل بھی دیتا ہے۔ اور درحقیقت آج کے دور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری عقیدت اور تعلق خاطر کا درست اور حقیقی مظہر بھی یہی امر ہے کہ ہم عملی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر مناسبت رکھتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اعمال اور افعال ہماری زندگیوں میں کس قدر موجود ہیں؟ یا ان کا پرتو کس حد تک ہمارے کارہائے زیست میں نظر آتا ہے، اس کے علاوہ محبت نبوی کی کوئی اور کسوٹی درست نتائج نہیں دے سکتی۔ رسوم اور رواج کے چنگل میں جکڑی ہوئی قوم کے لیے یہ امر شاید مشکل تو ضرور ہو، لیکن اس کے نتائج وثمرات اس قدر واضح اور بدیہی ہیں کہ ان کے سامنے آنے کے بعد کسی ہوش مند سے اس کا انکار سامنے نہیں آسکتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اسوۂ حسنہ کی جامعیت کو سامنے رکھتے ہوئے ہر شخص اپنے لیے اسے اپنی عملی زندگی میں سمولینے کا نظام وضع کرے اور اس پر دل وجان سے عمل پیرا ہو کر ہر شخص سنت نبوی کی عملی تصویر بن جائے، یہی درس سنت ہے، یہی پیغام سیرت ہے، یہی ملت کی ضرورت ہے، اسی میں خیر وفلاح مضمر ہے، اور اسی میں کام یابی وراحت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی برکتوں سے مالا مال کرے۔ آمین

۱۔ ترمذی: رقم ۲۰۰۲

کلام نبوت کی تاثیر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہونے والے معجزات میں سے ایک معجزہ فصاحت و بلاغت بھی ہے۔ اگر چہ قرآن حکیم اور کلام نبوی میں بین فرق ہے، لیکن کلام نبوی پر خطاب قرآنی کے اثرات بھی واضح حقیقت ہیں، بالکل اسی طرح جیسا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے عربی ادب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تاثیر کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں، جو ہمارے پیش نظر رہنے چاہییں اور جن کو اصول و قوانین کا درجہ دے کر ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سوزی، فکر مندی اور مدعو کے ساتھ سچی خیر خواہی زیادہ اہم ہیں۔

وعظ و تذکیر کے دوران اور دعوت و تبلیغ کے لیے سب سے اہم چیز مبلغ و داعی کی اپنے کام کے ساتھ نہایت صداقت و صدق دل کے ساتھ وابستگی ہے، یہی چیز اس کے اندر دل سوزی اور مدعو کے لیے خیر خواہی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ جب کہ دعوت تو ایسا عمل ہے، جس میں مدعو کی قلبی ماہیت اور دل کی دنیا یک سر تبدیل ہو جاتی ہے، ایسے میں کوئی شخص خاندانی پس منظر، تاریخی تسلسل، نظریاتی وابستگی، آبا و اجداد کی رعایات اور خاندانی وقار کو اس وقت تک نہیں بھلا سکتا جب تک کہ اسے داعی و مبلغ کی بے لوثی، خیر خواہی، دلی تعلق اور دل سوزی کا پختہ یقین نہ ہو جائے۔

اور جب ہم رسول رحمت علیہ الصلاۃ والسلام کی بات کرتے ہیں تو آپ کی حیات طیبہ

میں یہ عنصر زیادہ کمال کے ساتھ نظر آتا ہے، بل کہ پورے کمال پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ آپ کے بارے میں تو خود قرآن کریم کی گواہی موجود ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۱)

یہ تو کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے رحم دل ہیں اور اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (۲)

بے شک تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے، جس پر تمہاری تکلیف شاق گزرتی ہے، جو تمہاری بھلائی کا خواہش مند ہے، وہ مومنوں پر نہایت شفیق، مہربان ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و رافت، خیر خواہی اور دل سوزی کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر یقینی طور پر پڑا اور اس کی تاثیر میں کئی گنا اضافہ ہوگیا، ایسے کتنے ہی واقعات صفحات تاریخ پر نقش ہیں، جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایسی ہی گفت گو، تقریر یا خطاب کے ذریعے ماحول یک سر تبدیل کر دیا۔ پھر خود عرب کے حالات کا جائزہ لیجیے، عربوں کا مزاج ایسا نہ تھا جسے کوئی معمولی سا انقلاب تبدیل کر سکتا، مگر یہاں تو ان کا سارا سماجی ڈھانچہ، عبادات کا مزاج، خاندانی روایات اور طور طریقے سب ہی تبدیل ہو گئے۔ اس کے پیچھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پر حکمت دعوت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر اعتبار سے مثالی شخصیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور گفت گو کی سحر انگیزی ہی تو تھی اور خالق کائنات نے یہ خوبیاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا بھی اسی غرض سے کی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

۱۔ آل عمران: ۱۵۹

۲۔ التوبہ: ۱۲۸

سونپی جانے والی ذمے داری کئی وجوہ سے سابق انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر تھی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے اس نوعیت کے بہت سے نمونے موجود ہیں، مثال کے طور پر حضرت ضماد ازدوی رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے، آپ قبیلہ ازدشنوءۃ سے تعلق رکھتے تھے اور جنون وغیرہ کا علاج کیا کرتے تھے، وہ ایک بار مکہ مکرمہ آئے تو انہوں نے اہل مکہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) مجنون ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ کیا خبر اللہ تعالیٰ اس کے جنون کا علاج میرے ہاتھ سے کرادے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور کہنے لگے کہ میں جنون کا علاج کرتا ہوں اور بہت سوں کو اللہ نے میرے ذریعے شفا عطا فرمائی ہے، سو کیا میں آپ کا بھی علاج کروں۔ یہ سن کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ارشاد فرمائے جو اس دور سے آج تک خطبۂ مسنونہ کے تمہیدی کلمات کے طور پر امت مسلمہ میں رائج چلے آرہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إن الحمدالله نحمده و نستعينه، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادی له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له، وأن محمداً عبده ورسوله، أما بعد!

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، ہم اسی کی حمد کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں، جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گم راہ کرنے والا نہیں، اور جسے اللہ ہی راستہ نہ دکھائے تو اس کی کوئی رہ نمائی نہیں کرسکتا، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں، اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اما بعد!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ضماد رضی اللہ عنہ یہ کہہ اٹھے کہ یہ کلمات دوبارہ کہیے، سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ان کے سامنے تین بار دھرائے، اس کے بعد ضماد بے اختیار پکار اٹھے:

لقد سمعت قول الكهن و قول السحرة و قول الشعراء فما سمعت مثل كلمات ہؤلاء، ولقد بلغن باعوس البحر، قال فقال ہات يدک

أبایعک علی الاسلام (۱)

میں نے بہت سے کاہنوں، ساحروں اور شاعروں کے کلام سنے ہیں، لیکن ایسا (پراثر) کلام میں نے آج تک نہیں سنا، یہ کلمات تو اتاہ سمندر کی مانند ہیں، اپنا دست مبارک پڑھایئے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔

یہاں اس مثال سے مقصود یہ ہے کہ ان سادہ سے کلمات نے جو بے شک معانی سے پر تھے، آخر کس طرح اہل عرب کی دنیا بدل ڈالی؟ اس کے پیچھے بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت وبلاغت، آپ کی مثالی شخصیت اور ذاتی وموصوفی خصوصیات تھیں، لیکن اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی، دل سوزی اور پوری انسانیت تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی سچی خواہش اور ذاتی لگن کا بھی دخل تھا۔

آج ہم اپنی مصنوعی مرعوب کن خطابت کے تناظر میں ان خصوصیات کو دیکھیں تو اس کی حقیقت صحیح معنیٰ میں ہمارے سامنے واضح ہوگی، اور ہمارا ایمان ہے کہ اس جذبے سے اگر آج بھی کام لے کر میدان عمل میں اترا جائے تو منزل سہل ہو سکتی ہے، اور نتائج ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر سامنے آسکتے ہیں۔

۱۔ مسلم: ج ۲، ص ۱۴، رقم ۸۶۸۔ احمد: ج ۱، ص ۲۹۷۔ رقم ۲۷۴۴

ایمان کے تقاضے

غزوۂ خیبر اہم ترین غزوہ ہے، جو یہود جیسی سازش پسند اور سرکش قوم کے خلاف بپا ہوا۔ اس غزوے کے بہت سے واقعات اہم ہیں اور قابل مطالعہ و قابل ذکر بھی۔ آج کی نشست میں ایک واقعہ اسود راعی کا پیش کرنا مقصود ہے۔

خیبر والوں کا ایک حبشی چرواہا تھا۔ جب یہودی جنگ کی تیاری کر رہے تھے تو اس نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے، کس چیز کی تیاری ہے؟ یہودیوں نے کہا کہ اس شخص سے جنگ کا مرحلہ ہے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ سن کر اس چرواہے کے دل میں اسلام کا شوق پیدا ہوا، اور وہ اپنی بکریاں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ گیا۔ حبشی چرواہے نے جنابِ نبوت میں اور عرض کیا کہ آپ کیا کہتے ہیں اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے، اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور مجھے خدا کا رسول سمجھو۔ اس نے کہا کہ اگر میں خدا پر ایمان لے آؤں اور آپ کی نبوت کو قبول کر لوں تو کیا ہو گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جنت ملے گی۔ پھر اس نے عرض کیا کہ میرے پاس یہ بکریاں امانت ہیں ان کو کیا کروں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو قلعے کی طرف لے جا کر ہنکا دو اور ان پر کنکریاں مارو، یہ سب کی سب خود بہ خود اپنے مالک کے پاس چلی جائیں گی۔

اسود نے ایک پیالے میں کنکریاں بھر کر ان بکریوں کے منہ پر پھینک دیں اور ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ۔ خدا کی قسم اب میں تمہارا ساتھ

دینے والا نہیں ہوں۔ چناں چہ وہ بکریاں اس طرح جمع ہو کر واپس جانے لگیں جیسے کوئی چرواہا انہیں ہنکار رہا ہو۔ یہاں تک کہ وہ سیدھی قلعے میں داخل ہو گئیں۔

اس واقعے کی ایک اور روایت میں مزید تفصیل بھی مذکور ہے، جس کے مطابق کہ اس چرواہے نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا رنگ کالا ہے میرا چہرہ بدشکل ہے، بدن میں بدبو ہے، میرے پاس مال کچھ بھی نہیں۔ اگر میں خدا کی راہ میں لڑوں اور قتل کیا جاؤں تو کیا مجھے بھی جنت ملے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں ضرور ملے گی۔ اس کے بعد وہ لڑا اور شہید ہو گیا اور اس کی لاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائی گئی تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے کو حسین کر دیا اس کے بدن کو خوش بودار کر دیا، اور جنت کی دو حوریں اس کو عطا کر دی گئیں۔ (۱)

ایمان کے بہت سے تقاضے ہیں، جن میں سے جو باتیں تدریج کے ساتھ لازم ہوتی ہیں، وہ الگ ہیں، کچھ باتیں فوراً لازم ہو جاتی ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ باتیں از خود لازم ہو جاتی ہیں، انہیں اپنے مزاج کے حصہ بنانے کے لیے نہ تو خود پر جبر کرنا پڑتا ہے، نہ باہر سے کسی کی تنبیہ، تاکید اور تلقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ گویا ایمان کی پکار ہے۔ ان میں سب سے پہلے اللہ پر ایمان اور اس کی قدرت کا یقین ہے۔

قرآن حکیم میں جادوگروں کا قصہ بیان ہوا ہے۔ جنہوں نے فرعون کی دعوت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کی ٹھانی تھی۔ مگر جب عصائے موسیٰ حرکت میں آیا تو لحہ بواحد میں کفر و شرک اپنی تمام تر علامات کے ساتھ یوں رخصت ہوا کہ باور نہیں آتا۔ قرآن کے الفاظ میں، جب فرعون نے اپنے ہی بلائے ہوئے جادوگروں کو دیکھا کہ وہ

آمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (۲)

ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے۔

کہتے ہوئے رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہو گئے تو اس نے انہیں دھمکی دی کہ میں تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ اس عالم میں جب کہ انہیں جان کی دھمکی مل چکی تھی اور طاقت و رحکم

۱۔ واقدی: ج ۲، ص ۶۵۰۔ حلبی: ج ۲، ص ۷۴۰

۲۔ طہٰ: ۷۰

ران کے جبر وستم سے اچھلنے والی موت سامنے کھڑی دکھائی دے رہی تھی، ان جادوگروں نے یوں اپنے ایمان کی قوت پیش کی:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ (۱)

وہ کہنے لگے کہ ہم تجھے ہرگز ترجیح نہ دیں گے ان کھلی نشانیوں پر جو ہمارے پاس آچکی ہیں اور نہ اس پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ پس جو تجھے کرنا ہے کرلے۔ بے شک تو تو صرف اسی دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتا ہے۔

غزوہ خیبر کے حوالے سے درج ہونے والے واقعے میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

یہ قوت، یہ طاقت کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ یہ صرف اور صرف کلمۂ توحید کی برکت ہے، جو ہمیں صرف ایمان ہی عطا نہیں کرتا، بل کہ ایمان کو بھی نبھانے کے ناگزیر اور لازم تقاضے بھی ہمارے اندر غیب سے آنِ واحد میں پیدا فرما دیتا ہے۔ یہ ایمان کا اعجاز ہے، اور غور کرنے والوں کے لیے اس میں بڑی واضح نشانیاں ہیں۔

۱۔ طٰہٰ: ۷۲

شعوری محبت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بڑا معروف ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سفر کے دوران محبت کا ذکر آیا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اپنی ذات کے بعد ہر چیز سے بڑھ کر آپ سے محبت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تمہارا ایمان مکمل نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ اب مجھے اپنی ذات سے بھی بڑھ کر آپ سے محبت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الآن یا عمر

اے عمر! اب ٹھیک ہے۔

ایک سے زائد روایات و احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ اللہ کے رسول سے محبت کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا، مختلف کتب حدیث کی کتاب الایمان میں یہ بحثیں موجود ہیں۔

یہ واقعہ ذرا توجہ طلب ہے کہ آخر یہ کیسی محبت ہے جو لحہ واحد میں صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے سے پیدا ہوگئی؟ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ محبت کے دو بڑے درجے ہیں:

ایک جبلی محبت جو فطری ہوتی ہے۔ انسان اور جان ور کی اس میں کوئی تخصیص نہیں۔ اگر ایک انسان کے بچے کو اپنی ماں سے محبت ہے تو بلی کے بچے کو بھی اپنی ماں سے محبت ہے۔ مرغی کے چوزے کہاں بھاگتے ہیں؟ بطخ کے بچے کہاں لپکتے ہیں؟ سب کا مرجع اور ملجا و ماوی ماں ہی کی گود ہی ہوتی ہے۔ جبلی محبت بدل سکتی ہے، جیسے ماں باپ کا اولاد سے ناراض ہوجانا وغیرہ۔

دوسرا درجہ شعوری محبت کا ہوتا ہے۔ ایمان کا معاملہ اتنا ہلکا نہیں ہے کہ اس کو جبلی محبت پر چھوڑا جائے، جب تک شعوری محبت حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

حضرت عمرؓ کو توجہ دلائی اور ان کے واسطے سے امت کو یہ بات سمجھائی کہ مجھ سے جس محبت کا تقاضا ہے، اور جسے ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے، وہ دراصل شعوری محبت ہے۔ شعوری محبت اور جبلی محبت میں فرق آج ہم پوری دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کا معاملہ ہو، آپ کی سیرت، آپ کے اسوۂ حسنہ یا آپ کے احکامات کی خلاف ورزی ہو رہی ہو، کوئی بھی موقع ہو، کسی بڑی سے بڑی مخالفت پر بھی مجھ سمیت تمام اہل ایمان کے دلوں میں زرا جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کے لیے، آپ کے پیغام کے لیے کوئی سنجیدہ کام کرنا ہو تو بھی کوئی بڑی ہلچل نہیں ہوتی، لیکن اگر آپ کی ذات کے حوالے سے کوئی معاملہ درپیش ہو اور صرف شوشہ ہی چھوڑ دیا جائے کہ نعوذ باللہ کہیں توہین کا واقعہ ہوا ہے، تو بلا تحقیق بھی تو سوشل میڈیا پر ایک طوفان آجاتا ہے۔ عملی طور پر بھی لوگ سڑکوں پر آجاتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے جبلی یا فطری محبت کا نتیجہ۔ اسے جب تک شعوری محبت میں نہیں بدلا جائے گا، تب تک ہمارا ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ اس کو شعوری محبت میں کیسے بدلا جائے؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ نبوت کو اور ختم نبوت کو سمجھا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقام سمجھا جائے، انسانیت پر آپ کے احسانات وانعامات کو سمجھا جائے، تب ہی ہم اس لازمی، ضروری، شعوری محبت کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔

پھر ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کیوں کر محبت کرے؟ اس لیے کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ یہاں پر رشتے کچھ دو کچھ لو کی بنیاد پر استوار ہوا کرتے ہیں۔ ماں باپ سے کوئی کیوں محبت کرتا ہے؟ اس لیے کہ انہوں نے اسے جنم دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے شعوری محبت انسان کو اس وقت ہوگی، جب وہ یہ جانے گا کہ ہمیں آپ سے ملا کیا ہے؟ کیوں کہ محسن سے ہر ایک کو محبت ہوتی ہے بہ شرطے کہ وہ انسان شریف اور وفادار ہو۔ ایسا شخص دس روپے دینے والے کو بھی نہیں بھولتا، لیکن اگر اس کی انسانیت میں ہی ملاوٹ ہوچکی ہے تو پھر وہ لاکھ روپے کھا کر بھی ڈکار نہیں لے گا۔ وہ دس روپے کا احسان نہ بھلانے والا انسان اس ذات کو کیسے بھول سکتا ہے، جس نے ہمیں اتنا زبردست نظام عطا کر دیا۔ ایک ایسا نظام جس کے اندر دس ہزار خرابیاں ہونے کے باوجود بھی ہم سکون کا سانس لے سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کو ذرا اس دنیا سے علیحدہ کر کے دیکھیے تو پیچھے کیا بچے گا؟ چودہ سو سال پہلے کے حالات پر غور

کیجیے کہ کس طرح کی جہالت کا دور دورہ تھا؟ اگر اس دور میں ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی عالی مقام اور بلند صفات کی حامل شخصیت نہ ملی ہوتی تو سوچیے کہ آج ہماری کیا حالت ہوتی؟

سیرت طیبہ سے تعلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لازمی اور ناگزیر محبت کے تمام تقاضے اس ایک واقعے کی روشنی میں آسانی کے ساتھ سمجھے اور سمجھائے جاسکتے ہیں۔ یہ واقعہ پیش نظر رہے تو ہمارے لیے اس حوالے سے خود احتسابی کا عمل آسان ہو جاتا ہے کہ کیا ہم ایمان بالرسالت کی اس لازمی شرط کو پورا کر رہے ہیں؟ اور اگر پورا کر رہے ہیں تو کس قدر۔

اس واقعے کی روشنی میں یہ جاننا اس قدر آسان ہے کے ہمیں کسی اور میزان کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ایمان کو مکمل فرمائے اور اپنی کوتاہیاں اپنی زندگی میں ہی دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محبتِ نبوی کا اظہار

انسان روزِ اول سے نظریات تراشنے، افکار ڈھالنے اور خیالات سجانے سنوارنے کا شیدائی ہے، ان باتوں کو عوام میں بھی پذیرائی ملتی ہے۔ خواص بھی اس پر سر دھنتے ہیں، اور تاریخ بھی ان کا احترام کرتی ہے، یوں کہ ان افکار و خیالات کو بھی اور ان اصحابِ افکار کو بھی تا دیر یاد رکھتی ہے، اور آنے والوں تک ان کے خیالات منتقل کرتی ہے۔

مگر یہ سب باتیں ایک ایسے میزان میں آکر بے مول لگنے لگتی ہیں، جہاں ان افکار و خیالات کے قابل عمل ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بہت سے خیالات تو میزانِ عمل میں رکھنے کے قابل ہی قرار نہیں پاتے کہ وہ عقل انسانی کی رو سے ہی ناقابل عمل ٹھہرتے ہیں، اور اگر وہ خیالات اس پہلی منزل کو عبور کر بھی جائیں تو بھی اس لیے عوام و خواص کے لیے قابل توجہ نہیں رہتے کہ خود صاحب فکر و نظریے کا عمل ان کے افکار و خیالات کے برعکس و برخلاف نظر آتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، بائبل میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک حکم نقل ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر کوئی تمھارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم بایاں گال بھی آگے کر دو۔ اس قول کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف صحیح ہے یا غلط، اس سے قطع نظر یہ قول کسی طور قابل عمل نہیں گو بہ طور نظریہ بہ ظاہر یہ کتنا ہی خوش نما معلوم ہوتا ہو۔ اس لیے کہ یہ ایک تمثیل ہے، اور اس کے معنیٰ صرف گال اور تھپڑ تک محدود نہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بھی برائی کا جواب نہ صرف یہ کہ برائی سے نہیں دینا چاہیے، بل کہ اس کی برائی کو اپنی انتہا تک۔ پہنچانا چاہیے، اس لیے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص آپ کی جگہ مکا مار دے تب بھی یہی حکم ہوگا، اگر چھینا جھپٹی کا ماحول ہو اور کوئی شخص آپ سے ایک موبائل فون چھین لے تب بھی آپ پر لازم ہے کہ اگر دوسرا سیٹ آپ کے پاس موجود ہے تو وہ بھی اس کے حوالے کر دیں۔ علیٰ ھذا القیاس

محبت نبوی کے اظہار کے لیے بھی ہمارے پیمانوں میں افراط وتفریط کچھ اسی نوعیت کی معلوم ہوتی ہے۔ ایک جانب تو اہل ایمان ناموس رسالت پر کٹ مرنے کو تیار رہتے ہیں، جو ایمان کے ناگزیر ترین تقاضوں میں سے ایک ہے۔ دوسری جانب محبت نبوی کو ہم نے کچھ رسمیات سے ناپنے کا عمل بھی شروع کر رکھا ہے، ایک تو جس ذات بر برکات کی نسبت سے آفاقیت قابلِ اعتبار قرار ہے اس کی یاد کو ایک دن یا چند یوم تک محدود کرنا ظاہری طور پر بھی قدر ناشناسی ہی کہلائے گا، دوسری بات یہ ہے کہ اگر اسے ایک علامت قرار دے کر اس کو جواز عطا بھی کر دیا جائے، تب بھی اس کے تقاضے پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اور یہ تقاضے شریعتِ مطہرہ سے ہی معلوم ہو سکتے ہیں، اور ان کی مثالیں عہد نبوی اور عہد صحابہ ہی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام نے ذات رسالت مآب ﷺ سے اپنی محبت کا اظہار کس طرح کیا، اور ان کے انداز کیا تھے؟

غزوۂ احد کا واقعہ ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معرکہ احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے سعد بن الربیع کی تلاش میں روانہ کیا اور فرمایا کہ اگر سعد مل جائے تو انہیں میرا اسلام کہنا، اور کہنا کہ رسول اللہ ﷺ دریافت کر رہے ہیں کہ تم کیسے ہو؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مقتولین میں گھومتے گھومتے حضرت سعد تک پہنچا تو وہ اپنی حیات مستعار کے آخری سانس لے رہے تھے۔ اسی وقت ان کے جسم پر تیر، تلوار اور نیزے کے ستر زخم تھے۔ میں نے ان سے کہا سعد! رسول اللہ ﷺ تمہیں سلام کہتے ہیں اور تمہاری کیفیت کے متعلق دریافت فرما رہے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ پر سلام اور تم پر سلام۔ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں میری طرف سے عرض کرنا کہ میں جنت کی خوشبو پا رہا ہوں۔ پھر میری قوم انصار سے کہنا کہ ''اگر تمہاری زندگی میں رسول اللہ ﷺ تک دشمن پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔''

حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ کہتے ہی حضرت سعد کی روح ان کے جسم سے

پرواز کرگئی۔(۱)

سبحان اللہ اپنی زندگی کے آخری لحات میں بھی اس سچے محب کو رسول اکرم ﷺ کی ہی فکر دامن گیر تھی۔اس کے علاوہ انہیں نہ کسی چیز کی خواہش تھی، نہ کسی بات کا غم تھا، زخموں سے چور تھے، لحۂ آخر تھا، اور زباں پر رسول خدا ﷺ کی خیریت اور ان کی حفاظت کی وصیت تھی۔محبت نبوی کی اس سے بڑھ کر معراج کیا ہوگی۔

محبت نبوی کا ایک اور مظہر دیکھیے۔حضرت سلیم بن عامر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور رومیوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔(مدت معاہدہ ختم ہونے سے پہلے) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومی سرزمین کی طرف پیش قدمی شروع کردی، تاکہ مدت ختم ہوتے ہی ان پر نہایت خاموشی سے یلغار کردیں اور انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکے۔

عین اسی لمحے میں، جب اسلامی لشکر حملے کے لیے پوری طرح تیار تھا، ایک شخص گھوڑے یا کسی اور سواری پر یہ کہتے ہوئے نمودار ہوا: ''اللہ اکبر! اللہ اکبر! وفا کرو، بے وفائی نہ کرو۔'' لوگوں نے دیکھا تو وہ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلا کر ان سے اس بات کا سبب دریافت کیا۔انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو وہ مدت پوری تک اس میں کمی وبیشی نہ کرے یا انہیں معاہدے کے ختم کرنے کے بارے میں پیشگی اطلاع دے۔رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنتے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ سے واپس پلٹ گئے۔(۲)

یہ بات کاغذ پر شاید بہت ہلکی معلوم ہو، اسے بیان کرنا بھی شاید دشوار نہ ہو، مگر غور کیا جائے تو اس کے وزن کا اندازہ ہوگا کہ سونتی ہوئی تلواروں اور برہنہ نیزوں کے سائے میں گرم خون کے ساتھ جنم جنم کے دشمن کے مقابلے میں اترے ہوئے کسی سپہ سالار کا محض ایک فرمانِ نبوت سنتے ہی اپنے بڑھتے قدم روک لینا کیا معنیٰ رکھتا ہے، اور محبت نبوی کی کسی قدر معراج کی علامت ہے۔

۱۔حاکم۔المستدرک: ج ۳، ص ۲۰۱۔ابن ہشام: ج ۳، ص ۳۸

۲۔ابوداؤد: ج ۲، ص ۵۶۸۔ترمذی: ج ۲، ص ۱۱۳

قائد کون؟

قیادت ایثار اور قربانی چاہتی ہے۔ ہم مصنوعی قیادتیں دیکھ کر قیادت کا تصور ہی بھلا بیٹھے ہیں۔ لوگوں کا اعتماد اور اپنے مشن پر گرفت قربانی اور ایثار کے بغیر نہیں آسکتی۔ یہ قربانی مختلف نوعیتوں کی ہوتی ہے۔ دنیائے انسانیت کے سب سے سچے قائد نبی آخر الزمان ﷺ کی حیات مبارکہ سے جہاں ہم حیات انسانی کے دوسرے بہت سے بل کہ بے شمار پہلوؤں پر ہدایات اور رہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں، وہیں قیادت کے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ میسر آسکتا ہے۔

سفرِ غزوۂ بدر کا واقعہ ہے، سب جانتے ہیں کہ بے سروسامانی کا عالم ہے۔ ایسے عالم میں جب وسائل کی کمی ہو، اور استعمال کرنے والے ہاتھ زیادہ ہوں تو قربانی ہمیشہ قیادت کے پیچھے چلنے والے افراد ہی دیتے ہیں، اور مساوات کا عملی مظاہرہ بھی ان ہی کے لیے ہوتا ہے۔ قیادت اپنے رفقا کے ہم راہ ان ذمے داریوں سے مبرا اور ماورا ہوتی ہے۔ مگر یہاں سچے قائد ﷺ کا عمل مبارک ملاحظہ کیجیے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن ہم لوگ سواریوں کی قلت کی وجہ سے ایک اونٹ پر تین تین سوار ہوتے تھے۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جناب رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ اونٹ پر باری باری سواری ہوتی تھی۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کی پیدل چلنے کی باری آئی تو ابولبابہ اور جناب علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

آپ تشریف رکھیں، ہم آپ کی طرف سے باری باری پیدل چلتے رہیں گے۔

اس پر رسول کریم ﷺ نے جواب دیا:

ما انتما باقوی منی ولا انا باغنی عن الاجر منکما(۱)

تم دونوں مجھ سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو اور نہ میں تم دونوں سے زیادہ اجر سے مستغنی ہوں۔

اس مختصر سے جملے میں رسول اللہ ﷺ نے دو بہت بڑی حقیقتیں کھول کر رکھ دی ہیں:

الف: انسان کے لیے رعایت کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ کسی جسمانی کم زوری میں بتلا ہو جائے۔ محض شرف اور منزلت کی بنیاد پر رعایتیں حاصل کرنا قیادت کا شیوہ نہیں، کم از کم اس واقعے اور اس قول مبارک سے اسوہ نبی رحمت ﷺ یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور چوں کہ میں تم سے کم زور نہیں ہوں، نہ تم مجھ سے زیادہ مضبوط، توانا اور طاقت ور ہو۔ اس لیے میں خصوصی سلوک کا مستحق نہیں۔

ب: قیادت کا منصب ایک ذمے داری ہے۔ خواہ قیادت مذہبی ہی کیوں نہ ہو، کسی صورت میں بھی اس منصب پر آنے سے انسان اجر وثواب سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا، اور اجر وثواب کا تعلق مشقت، محنت اور ریاضت سے واضح ہے، سو میں یہ رعایت حاصل کر کے اپنے اجر میں کمی کیوں کروں؟

یہ ایسی ذات کا اسوہ حسنہ ہے، جو محض اس موقع پر قیادت کے منصب پر فائز نہیں تھی، بل کہ آپ کی ذاتِ مبارکہ میں کئی مناصب جمع تھے، آپ مدینہ منورہ کی ریاست کے فرماں روا تھے، جس کی حیثیت کو صرف وہاں کے جان نثارانِ نبوت نے نہیں وہاں کے ان یہود وغیرہ بھی تسلیم کیا تھا، جو دامانِ نبوت سے رشتہ ایمانی میں منسلک بھی نہیں تھے۔ آپ ﷺ سپہ سالار تھے، ہزاروں صحابہ کے متفقہ قائد تھےؓ ان کے لیے واحد وتنہا مرکز رشد وہدایت تھے، ایسے میں یہ رعایتیں خصوصاً آج کے ماحول میں تو رعایت سے زیادہ استحقاق معلوم ہوتی ہیں، مگر نبی رحمت ﷺ اپنی مشقتوں میں اضافہ کر کے نہ صرف اجر عظیم کے مستحق ہوئے بل کہ اپنے ماننے والوں کو بھی ایک اہم سبق عطا فرما دیا۔

اس سبق کی روشنی میں ہم اپنی عام قیادت کو دیکھیں یا مذہبی قیادت کو، ہر جانب ایک

۱۔ صحیح ابن حبان: رقم ۴۷۳۳

عجیب رویہ سامنے آتا ہے۔ ہر ایک ''پروٹوکول'' کے خود ساختہ وسوسے اور مخمصے ہیں مبتلا و محصور دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ جب ہم منصب و مسند کی وجاہت رکھنے والوں کو ''ہٹو بچو'' کی صداؤں میں عوام الناس کے درمیان سے گزرتا دیکھتے ہیں، تو ہم میں ایک ردِعمل پیدا ہوتا ہے اور طبقاتی تقسیم کی برائیاں کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں، مگر عین اس لمحے ہمارے دل کے کسی حصے میں اس نوعیت کے اعزاز کے حصول کی خواہش بھی مزید شدت سے سر ابھارنے لگتی ہے، یہ تضاد ہے۔ اس نوعیت کے تضادات انسانی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور تقسیم شدہ انسان کسی میدان میں بھی کام یاب نہیں ہو سکتا۔ نہ مادی اعتبار سے نہ روحانی اعتبار سے۔

زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ مذہبی عرفیت رکھنے والوں کے ہاں بھی ظاہری طمطراق، اٹھنے بیٹھنے میں تصنع و تکلف اور بعض صورتوں میں دوسروں کے لیے مضر اور نقصان کا باعث بننے والا اعزاز و اکرام تیزی سے بڑھتا اور پروان چڑھتا نظر آ رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید وہ، جنھیں معاشرے پر اثر انداز ہونے کا منصب عطا کیا گیا تھا، خود اثر قبول کر رہے ہیں، یہ بات اور کتنی وجوہ سے غلط کیوں نہ ہو، خود قیادت کے منصب کے بھی منافی ہے۔ قیادت اثر انداز ہونے کا نام ہے، بیرونی اثرات قبول کرنے کا نہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اثر قبول کرنے والوں سے بڑے میدان میں کس طرح کام یابی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔

اعزاز، خصوصاً دنیاوی اعزازات دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو از خود، ذاتی تگ و دو، محنت و ریاضت اور کوشش و کاوش کے بغیر میسر آ جائیں، اور دوسرے وہ جن کے لیے انسان اپنی جان کھپا دیتا ہے۔ پہلی نوعیت کے اعزازات قدرت کا عطیہ ہیں، ان کو قبول کرنے میں قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ انھیں بھی انعام ربانی سمجھ کر ہی قبول کرنے چاہییں، اور اس میں بھی یہ احتیاط ضروری ہے کہ اسے اپنا استحقاق نہ سمجھا جائے، نہ جتایا جائے۔ اس کی کسوٹی یہ ہے کہ ایسا کچھ میسر نہ ہو، یا میسر آنے کے بعد واپس لے لیا جائے تو نہ دل پر بار ہو، نہ زبان شکوے شکایت سے آلودہ ہو۔

خصوصیت کے ساتھ وہ، جو یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ان کی تگ و دو کا محور اور مقصد آخرت اور رضائے الٰہی کا حصول ہے انھیں اشارے کنائے میں بھی ایسی حرکتوں سے اپنا دامن بچانا چاہیے، جہاں عامۃ الناس سے انفرادیت اور امتیاز کا کسی کو شبہ گزرنے کا بھی امکان ہو، چہ

جائے کہ اسے اپنی طرزِ حیات کا عنوان جلی قرار دے کر اس طرح سے اس کو لازم کر لیا جائے کہ یہ جاہ و جلال اور تزک و احتشام ان کی شخصیات ناگزیر حصہ نظر آنے لگے۔ یہ خطرناک مرحلے ہیں، یہاں برسوں کی محنت لمحوں میں لٹ جاتی ہے، اور سونے کے ڈھیر دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اعاذنا اللہ منہ

قیادت کا امتحان

سیرت کے اوراق عجیب وغریب واقعات سے پُر ہیں۔ جن سے ہمیں حکمت بھی حاصل ہوتی ہے، اور بصیرت بھی، نیز زندگی برتنے کا سلیقہ بھی میسر آتا ہے۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے اور زبیرؓ اور مقدادؓ کو حکم دیا کہ روانہ ہو جاؤ۔ جب تم روضۂ خاخ (ایک جگہ کا نام) پر پہنچو گے تو وہاں تمہیں مشرکین کی ایک عورت ملے گی، جس کے پاس ایک خط ہوگا۔ ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیے۔ ہم نے اس عورت کو اونٹ پر سفر کرتے ہوئے اس جگہ پایا جس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ہم نے اس سے کہا کہ خط کہاں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرے پاس خط نہیں ہے۔ ہم نے کہا یا تو تم خط نکال کر دے دو ورنہ ہم خود تمہاری تلاشی لیں گے۔ اس نے خط نکال کر ہمیں دے دیا، اور ہم خط لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

جب خط پڑھا گیا تو اس میں لکھا ہوا تھا کہ حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مشرکین مکہ کے نام۔ اس میں انہوں نے مشرکین کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض امور کے بارے میں اطلاع دی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے حضرت حاطب کو بلایا اور فرمایا کہ حاطب یہ کیا ہے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ میرے بارے میں فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہ لیں۔ (مکے کی زندگی میں) میں قریش کے ساتھ رہتا تھا اور ان سے میرا تعلق صرف حلیف ہونے کا تھا، ان سے میری کوئی قرابت نہیں تھی۔ آپ کے ساتھ جو دوسرے مہاجرین ہیں ان سب کی قریش کے ساتھ قرابت ہے۔ اس لیے ان کے عزیز واقارب، وہاں ان کی اولاد کی اور ان کے امور کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر میرا ان سے کوئی نسبی تعلق نہیں، اس لیے

میں نے چاہا کہ ان پر احسان کر دوں اور وہ اس کے بدلے میں میرے رشتے داروں کی حفاظت کریں۔ میں نے یہ کام مرتد ہو کر (دین سے پھر کر) نہیں کیا اور نہ اسلام لانے کے بعد میرے دل میں کفر کی حمایت کا کوئی جذبہ ہے۔ اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ اکرام سے فرمایا کہ اس نے سچ کہا۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن مار دوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ غزوہ بدر میں شریک رہے ہیں اور فرمایا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے تمام احوال دیکھ کر ہی (کہ وہ آئندہ کیا کریں گے) یہ فرمایا ہے۔ ''جو چاہو کرو پس میں نے تمہارے لیے جنت کو واجب کر دیا ہے یا میں نے تمہاری مغفرت کر دی'' دوسری روایت میں ہے کہ یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔(۱)

دیکھیے اس واقعے میں جرم بھی موجود ہے، جرم بھی سنگین ہے، اس قدر سنگین کہ اس کی بنیاد پر انتہائی اہم معرکے میں پوری حکمت عملی ناکام ٹھہر سکتی تھی، اگر یہ خط مکے تک پہنچ جاتا، تو مسلمانوں کو بڑی تعداد میں جانی و مالی نقصان بھی ہو سکتا تھا، مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا رویہ اور ردعمل دیکھیے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت ہو تو اس جرم کی انتہائی سزا نافذ کر دی جائے؟ مگر یہاں کا مزاج الگ ہے، یہ وہ ذات ہے جو جوڑنے آئی ہے، نبھانے آئی ہے، خطا کار سے درگذر کرنے اور ستم شعار کو اپنے دامانِ رحمت میں سمونے کے لیے آئی ہے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فیصلہ دوسروں سے نمایاں اور الگ نہ ہو تو یہ رحمۃ للعالمینی کیسی؟ یہ بیان کرنے کی نہیں دیکھنے اور محسوس کرنے کی صفت تھی۔ اس واقعے نے یہ صفت سب کے لیے قابل عمل بنا دی۔

اس واقعے میں ہمارے لیے کئی سبق پوشیدہ ہیں۔ ادارے قربانیوں سے کھڑے ہوتے ہیں، ایثار سے مستحکم ہوتے ہیں، اور عفو و درگزر کے ساتھ ساتھ رحم و کرم اور محبت و شفقت سے پروان چڑھتے ہیں۔ یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ سختی، سزا اور گرفت ایک انتظامی ضرورت ہے،

۱۔ بخاری: ج ۳، ص ۷۸، رقم ۴۲۷۴۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۸۸

جس سے انکار نہیں، یہ ضرورت ہر دور میں موجود رہی ہے، اور ہر ایک نے اس سے کام لیا ہے۔ یہ ایک انسانی ضرورت ہے، جو دین مکمل نظامِ حیات دینے کا دعوے دار ہو، اس میں اس کی رعایت لازمی ہے، ورنہ اس کا دعویٰ ہی ادھورا رہے گا، اس لیے اس کا اثبات اور بہ وقت ضرورت اس کی اجازت قرآن حکیم میں بھی ہے اور سنت مطہرہ میں بھی۔ مگر قیادت کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ اس ضرورت کو محدود کس طرح رکھتے ہیں اور اپنے مقاصد کے ساتھ اس میں توازن کیسے پیدا کرتے ہیں۔ جب انسان صاحبِ اختیار بھی ہو تو وہ اپنا حکم رد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، اس کی سب سے بھی بڑی آزمائش اس لمحے اپنے جذبات پر گرفت اور درست حقیقت تک رسائی ہے۔ جس کے لیے بڑا تحمل درکار ہے۔ آپ ﷺ نے اس واقعے میں ہر اس شخص کو، جو چند افراد پر نگراں بنایا گیا ہے، یہی پیغام دیا ہے کہ وہ ایک واقعے کی بنیاد پر فیصلے کرنے کے بہ جائے اس کا پس منظر جاننے کی کوشش کرے، اس کے اسباب پر نظر رکھے اور اس کی علت تلاش کرے اور پورے غور وخوص کے بعد متعلقہ فرد کی پوری تاریخ اور اس کا ماضی سامنے رکھ کر رائے قائم کرے۔ تب ہی درست فیصلہ ہو سکے گا۔

انسان عملی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز سے گزرتا ہے، اس کی زندگی کے یہ اتار چڑھاؤ ہی اس کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں، ان تمام اجزا سے انسان بنتا یا بگڑتا ہے، ان اجزا کے مجموعے کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس کا کوئی ایک حصہ حذف کر کے اس کی پوری شخصیت کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ہر عمل کو جانچنے کے لیے بیلنس شیٹ بنائی جاتی ہے، اسی بنیاد پر دنیاوی امور کے فیصلے ہوتے ہیں، اور حدیث کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ مگر ہم عملی زندگی میں کسی دوسرے شخص کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں۔

ہماری نظر میں ایک منفی پہلو یا ایک غیر مثبت واقعہ پوری زندگی کی کارکردگی کو ختم کر دیتا ہے، یہ متوازن رویہ نہیں ہے، اسی طرح کسی شخص کی ایک دو باتوں سے اختلاف کی صورت میں بھی اس سے استفادے کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہماری اپنی محرومی ہے، ہم خود اپنے سیکھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ان رویوں کو دیکھنے اور متوازن بنانے کا نام ہی دین ہے۔ کسی ایک پہلو کو لے کر دین کے ہی دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کرنا یا ان کی اہمیت کم کرنا

دین کا تقاضا نہیں ہے، اور ان کم زوریوں سے پہلا نقصان انسان کی اپنی شخصیت کو ہی ہوتا ہے۔ مگر پھر یہ اثرات اس شخصیت تک محدود نہیں رہتے، بل کہ بعد میں اس کے اثرات معاشرے تک پہنچ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم کشادہ دلی اور حسنِ ظن کے ساتھ غور و فکر کرسکیں اور احتیاط کو اپنا وظیفہ بنا سکیں۔

بلند اخلاق، علامتِ ایمان

ایمان کسی بھی مسلمان سے اسلام کا پہلا مطالبہ ہے، پھر ایمان کی شاخیں گنوائی جاسکتی ہیں، ایمان میں کمی یا زیادتی کی بحث کی جاسکتی ہے، ایمان کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں فلسفیانہ، متکلمانہ، صوفیانہ اور فقہی اسلوب میں گفت گو ہوسکتی ہے۔ لیکن ایمان کا اگر مختصر مفہوم بیان کیا جائے تو صرف اسی قدر کافی ہے کہ اللہ کو اور اس کے احکامات کو دل اور زبان کے ذریعے قبول کرنا۔ پھر ایمان کے جیسے مدارج ہیں، صفات ہیں، شرائط ہیں اور مقتضیات ہیں، جن کا پورا کرنا ہر اس شخص پر لازم ہے جو ایمان لانے کا دعوے دار ہے، اسی طرح اس کی کچھ علامات بھی ہیں اور ان علامات میں سے ایک حسنِ خلق ہے، جس کا بیان اس سطور میں مطلوب ہے۔

حسن خلق ایک نیکی ہے، ایسی نیکی جس کا دوسرا سرا ایمان کی تکمیل سے جڑا ہوا ہے۔
رسولِ خدا علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:

البر حسن الخلق، والاثم ما حاک فی صدرک، وکرہۃ ان یطلع علیہ الناس (۱)

نیکی (بھلائی) حسنِ خلق کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تمہیں یہ بات بری محسوس ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہو جائیں۔

یعنی حسنِ خلق خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو، نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ بد اخلاقی اس کے مقابلے میں ایک تسلیم شدہ برائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں حسنِ خلق

۱۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۶۶، رقم ۲۵۵۳

کو بھلائی اور نیکی کے ساتھ بیان کیا ہے، اسی طرح دوسری روایت میں فرمایا

المومن غر کریم والفاجر خب لئیم (۱)

مومن سادہ اور سخی جب کہ فاجر فریب دینے والا اور بخیل ہوتا ہے۔

دونوں مقامات پر درس یہی دیا جارہا ہے کہ ہر طرح کی اخلاقی کم زوری ایمان کے اور اس کے لوازم و مقتضیات کے منافی ہے اور ہر طبعی خوبی و فطری نیکی ایمان کی علامت ہے۔ اس لیے اخلاقی کم زوریوں کا دور کرنا جس طرح ہمارے لیے معاشرتی تقاضوں کو نبھانے کے لیے ضروری ہے، وہیں اپنے ایمان کو بچانے، محفوظ کرنے اور اس کی تکمیل و تزئین کی خاطر بھی ضروری ہے۔

درحقیقت ایمان ایک ایسی قوت ہے جو صفاتِ مذمومہ اور اخلاقِ رذیلہ سے انسان کی حفاظت کرتی، اس کے اندر پاکیزہ صفات اور اخلاق حسنہ کو پروان چڑھاتی اور ان کی جانب اس کو راغب کرتی ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے جب بھی اپنے بندوں کو کسی بھلائی کی طرف بلایا، یا انہیں کسی برائی کے خلاف ابھارا اور اس کی شناعت کو ان کے سامنے واضح کیا تو ان کے ایمان کو ضرور اس مقصد کے لیے واسطہ بنایا، اللہ سے ڈرنے، تقویٰ اختیار کرنے اور صداقت شعارت کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۱۹﴾ (۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

یہاں جن عظیم مقاصد کی جانب لوگوں کو توجہ دلانا مقصود ہے، ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے پہلے فرمایا يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اے ایمان والو! گویا ایمان کے بعد تمہارے لیے یہ بھی لازم ہے کہ ان صفات حسنہ کو اختیار کرو، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مقامات پر اس کی وضاحت فرمادی ہے کہ اگر ایمان مستحکم اور طاقت ور ہوگا تو اس سے نہایت مضبوط اور پائیدار اخلاق جنم لے گا، اور اگر اخلاق میں کم زوری ہے وہ روبہ زوال

۱۔ ترمذی: ج ۳، ص ۳۸۸، رقم ۱۹۷۱

۲۔ التوبہ: ۱۱۹

ہے، یا اس میں مومنانہ پختگی کا فقدان ہے تو یہ بہ جائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا ایمان بھی طاقت ور نہیں ہے، اس میں بھی کم زور اور کمی موجود ہے، جو اس کے اخلاقی پہلو کو متاثر کر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

حیا اور ایمان دونوں جڑواں بھائی ہیں، جس نے ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دیا، اس نے دوسروں کو بھی کھو دیا(۱)

گویا کہ ایمان اور اخلاق (جس کی ایک شاخ حیا کا حدیث میں ذکر فرمایا گیا) دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، نہ اخلاق کی تکمیل ایمان کے بغیر ممکن ہے، نہ ایمان اخلاق حسنہ کے بغیر مکمل قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایسا اخلاق پاکیزہ کردار، جو زندگی کے ہر شعبے میں نظر آئے، اسلام کی نظر میں اور تعلیماتِ نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی رو سے ایسی دولت ہے، جس کا بدل دوسری کوئی نیکی نہیں، اور جو کوئی اس سے محروم ہے، وہ نیکیوں کے انبار اور دولت کے خزانے رکھنے کے باوجود بھی حد درجہ مفلس ہے، ایسا مفلس جس کی مفلسی کو دور کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے استفسار کیا کہ جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ مفلس وہ ہے جو درہم ودینار نہ رکھتا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان المفلس من امتی یاتی یوم القیامة بصلاة وصیام وزکاة، ویاتی قد شتم ہذا، و قذف ہذا، واکل مال ہذا، و سفک دم ہذا، وضرب ہذا، فیعطی ہذا من حسناته وہذا من حسناته، فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه، اخذ من خطایاہم فطرحت علیه، ثم طرح فی النار(۲)

میری امت میں مفلس وہ شخص ہوگا جو روز قیامت اپنے رب کے سامنے

۱۔ مستدرک حاکم

۲۔ مسلم: ج۴، ص۱۷۹، رقم ۲۵۸۱

حاضر ہوگا، اس نے نمازیں پڑھی ہوں گی، زکاۃ دی ہوگی، روزے رکھے ہوں گے، لیکن ان کے ساتھ ساتھ کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، کسی کا ناحق خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا، تو اس کی تمام نیکیاں ان مظلوموں کو دے دی جائیں گی، جن کا حق اس کے ذمے نکلے گا، اور اگر اس کے مظالم ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی نیکیاں ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں تو ان مظلوموں کے گناہ اس کے کھاتے میں منتقل کر دیے جائیں گے، اور پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

أعاذنا الله منه

اس شخص کی مثال بالکل واضح ہے، بعینہ اس تاجر کی طرح جو اپنی ملکیت میں ایک لاکھ روپے تو رکھتا ہے مگر ڈیڑھ لاکھ کی رقم دوسروں کی اس کے ذمے واجب الادا بھی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اسے مال دار کس طور کہا جاسکتا ہے؟

یہی صورت آج ہماری بھی ہے ہم میں سے جو دین دار ہیں، وہ اگر نماز روزے کی پابندی کرتے ہیں، مالی امور میں بھی نیکی کے راستوں میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، مگر دنیاوی اعتبار سے اپنے سے کم تر افراد سے ان کا رویہ ہمدردانہ یا خیر خواہانہ نہیں، بل کہ تحقیر اور تذلیل کا ہے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تو کجا ان سے عام انسانی برتاؤ میں بھی اخلاقی اصولوں اور اسلامی تعلیمات کا خیال نہیں رکھا جاتا، تو وہ کیسے متقی قرار دیے جاسکتے ہیں؟

اسی طرح اگر معمول کی عبادات بجالانے والے یا ان کی بجا آوری میں زیادہ تندہی اور سرگرمی کا مظاہرہ کرنے والے اگر معاملات میں کجی دکھا جائیں۔ امانت و دیانت، ایفائے عہد، وعدے کی پابندی کرنے اور ہر طرح کی بدعنوانی سے بچنے کی بہ جائے ان میں بری طرح ملوث ہو جائیں۔ نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ رشوت کا بازار بھی گرم رہے، روزے تو رمضان کے علاوہ بھی جاری رہیں، مگر اجناس میں ملاوٹ بھی عروج پر ہو۔ زکاۃ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ دیگر فلاحی و رفاہی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور سود خوری کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ ہر سال عمرے اور حج کی ادائیگی کا التزام بھی ہو اور ملکی، دفتری اور کاروباری قوانین کو پامال کر کے دولت بھی دونوں ہاتھوں سے سمیٹی جارہی ہو، تو یہ اخلاقی کم زوری اور معاملات کی

کبھی ان عبادات کو بھی کھا جائے گی اور آخرت میں، حساب کے روز حدیث کے مطابق ہاتھ کچھ نہ آئے گا، غیر فائدہ مند پشیمانی اور دائمی رسوائی کے سوا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اِس سے محفوظ رکھے اور عاقبت بخیر کرے، آمین۔

ویسے بھی سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ایمان کی کیا قیمت ہو سکتی ہے، جس کے ساتھ حسنِ اخلاق کی نعمت و دولت نہ ہو؟ انسان اللہ تعالیٰ سے انتساب بھی رکھے اور کردار کا کچا اور عادات کا کج رو بھی ہو، ایسے شخص کو مومن کامل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ کجا کہ وہ متقی بھی سمجھا جائے، جو اس کے بعد کا مرحلہ ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> اربع من کن فیه کان منافقاً خالصا، ومن کانت فیه خصلة منهن کانت فیه خصلة من النفاق حتی یدعها، اذا اؤتمن خان، واذا حدث کذب، واذا عاهد غدر، واذا خاصم فجر (۱)
>
> چار خصلتیں ایسی ہیں جو اگر کسی کے اندر پائی جائیں گی تو وہ مکمل منافق ہوگا، اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک پائی جائے تو وہ منافقت کی ایک خصلت رکھنے والا ہوگا، جب تک وہ اسے ترک نہ کر دے، (وہ چار خصلتیں یہ ہیں) جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو ایفا نہ کرے اور جب لڑائی جھگڑا کرے تو گالم گلوچ پر اتر آئے۔

یہ حدیث ہمارے لیے بہترین کسوٹی ہے، جس پر ہم اپنا احتساب کر سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ ہم ایمان کے کس مرحلے میں ہیں، اور عام اخلاقیات کے اعتبار سے ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟

۱۔ بخاری: کتاب الایمان، باب علامت المنافق

حسنِ خلق

حسن خلق بھی ایمان کے ان شعبوں میں سے ہے، جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہے، اگرچہ اس کے اثرات، ثمرات و برکات سے خود صاحب اخلاق ہی سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو حسن اخلاق کے اس عظیم مرتبے پر فائز تھے کہ قرآن نے یہ گواہی دی:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱)

اور آپ تو بلاشبہ خلق عظیم پر فائز ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق (۲)

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن خلق اور اخلاق حسنہ پر اس قدر زور دیا ہے کہ اسے اپنی بعثت کا ایک اہم مقصد قرار دیا ہے، یہی بات دوسری روایات میں ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے:

انما بعثت لاتمم صلاح الاخلاق (۳)

مجھے تو خاص نیک اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قولی احادیث کے ذریعے اخلاق حسنہ کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ یہ دعا بھی فرمائی:

۱۔ القلم: ۴

۲۔ امام مالک۔ الموطا: باب حسن الخلق

۳۔ مجمع الزوائد: ج ۸، ص ۵۷۴، رقم ۱۴۱۸۸

اللّٰهم احسنت خلقی، فحسّن خلقی (۱)

اے اللہ جیسے تو نے میری صورت اچھی بنائی ہے، اسی طرح میرے اخلاق بھی بہترین بنادے۔

یقیناً آپ ﷺ نے اپنے اس عمل کے ذریعے ہمیں یہ تلقین فرمائی کہ صرف ظاہر کا انسان ہی سب کچھ نہیں ہے، باطنی خوبیاں بھی برابر کی اہمیت رکھتی ہیں، اور انسانیت کی صحیح معنی میں تکمیل اسی وقت ہوگی، جب صورت اور سیرت دونوں انسانیت کے معیار پر پورا اتریں، اور دونوں خوبیاں کمال کو پہنچی ہوئی ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا مطالعہ کیجیے تو حسن خلق آپ کی ہر اہم صفت کے ساتھ ساتھ نظر آئے گا، مثال کے طور پر سخاوت کے ذیل میں آپ ﷺ کے کئی ایک واقعات کتب حدیث میں ملتے ہیں، ان میں کئی واقعات ایسے ہیں جب سائل نے سوال کرتے ہوئے درشتی کا مظاہرہ کیا مگر آپ ﷺ نے اس کی سختی کے جواب میں کسی قسم کی سختی نہیں دکھائی، بل کہ ایسے انداز میں اسے مطمئن کیا کہ وہ آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کا گرویدہ ہوگیا۔

آپ ﷺ نے کردار و گفتار سے جو پیغام ہم تک پہنچایا، وہ یہی تھا کہ حسن خلق بندۂ مؤمن کے لیے ایک لازمی صفت ہے، جس کا کوئی بدل نہیں اور دوسری کوئی صفت اس کی جگہ نہیں لے سکتی، نہ اس کی نیابت کرسکتی ہے، اس لیے اسے ہر صورت میں حاصل کرنا ہوگا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے آں حضرت ﷺ سے حاضری کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بہت برا آدمی ہے، پھر آپ ﷺ نے اسے حاضری کی اجازت دے دی اور اس کے اندر آنے پر اس کے ساتھ نہایت نرمی سے باتیں کیں، جب وہ شخص چلا گیا تو میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو اس کے بارے میں یہ کچھ ارشاد فرمایا تھا، مگر پھر آپ نے اس سے اس قدر نرمی کے ساتھ بات چیت کی، یہ کیا بات ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

یا عائشه ان من شر الناس من ترکه الناس او ودعه الناس اتقاء

۱۔ احمد: ج ۱، ص ۶۶۵، رقم ۳۸۱۳

فحشہ (۱)

اے عائشہ! لوگوں میں سے بدتر شخص وہ ہے، جسے لوگ اُس کی بدکلامی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

اس واقعے سے ہمیں کئی سبق ملتے ہیں، مثلاً ایک تو یہی کہ بدکلامی ایسی ناپسندیدہ اور مکروہ صفت ہے، جسے خصوصاً ایک بندۂ مؤمن کو کسی صورت میں بھی اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان کو ایسے لوگوں کے ساتھ بھی نرم گفتاری کا مظاہرہ کرنا چاہیے جن کو وہ بہ وجوہ پسند نہیں کرتا، یا جن سے اسے شکایت ہے۔

انسانی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں، جب انسان کو ایسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے، جن کو وہ پسند نہیں کرتا، یا جن سے وہ ملنا نہیں چاہتا، ایسے مواقع پر مختلف افراد مختلف طرح کے ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ بعض تو یک سر کتراتے ہوئے نکل جاتے ہیں، یا کوشش کرتے ہیں کہ ملاقات نہ ہو۔ بعض ایسے موقع پر اپنے دلی جذبات کا بھرپور طریقے سے اظہار کرتے ہیں اور سامنے والے شخص کے احساسات اور جذبات کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ جب کہ ایسے کسی موقع پر غالباً صحیح طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ فریق ثانی کے بارے میں اپنے خیالات پر قائم رہتے ہوئے، اس کے بھی احساسات اور جذبات کا احترام رکھا جائے، ورنہ کم از کم اس قدر خیال ضرور رکھا جائے کہ وہ آپ کے بارے میں کوئی بُرا تاثر لے کر نہ اٹھے، خصوصاً بدکلامی کی بالکل گنجائش نہیں ملتی، اگر اپنی بات کہنا ناگزیر بھی ہو، تب بھی ایسے جملوں کا انتخاب کیا جائے، جو بات تو پوری طرح پہنچا دیں، مگر اس کے منفی اثرات کم سے کم ہوں۔

یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب ہمیں اپنے جذبات پر پوری طرح اختیار حاصل ہو اور ہمیں معلوم ہو کہ کس مرحلے پر ہمارا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟

اس بات کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ بسا اوقات کسی کی غلط بات پر تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔ اس کے لیے اسے کچھ کہنا ضروری ہوتا ہے مگر اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا جائے جو اسے اپنی اصلاح پر آمادہ کرے، نہ کہ الٹا وہ آپ کے رویّے سے شاکی ہو جائے۔

۱۔ ترمذی: ج ۳، ص ۴۰۱، رقم ۲۰۰۲

حسن خلق اور خندہ پیشانی ایک مؤمن کی صفت اور ایمان کی علامت ہے، اس کے برخلاف، تصنع، تکلف بھرا انداز، مصنوعی لب ولہجہ اور چہرے پر خاص قسم کی خشونت اس کی ضد ہے، یہ سب کچھ متانت کا حصہ نہیں ہے، وقار ومتانت بھی ضروری ہے، مگر یہ سرد مہری اور ترشی کے بغیر بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ بل کہ حقیقت تو یہ ہے کہ خندہ پیشانی اور حسن خلق کا متانت ووقار سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، لیکن خشونت اور تصنع بھرا انداز حسن خلق کے منافی ضرور ہے اور اسے چہرے اور انداز کی بدکلامی بھی کہا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین۔

حکمت کی برکت

صلح حدیبیہ جیسے اہم ترین موقع کا قصہ ہے، مشرکین مکہ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے صحابہ کرام کے ہمراہ عمرے کی ادائیگی سے روک دیا ہے، مسلمان حالت احرام میں ہیں، مشرکین سے بات چیت جاری ہے، مگر مشرکین مکہ کے ساتھ ان کی من ساختہ کچھ مجبوریاں ہیں، یوں بحث مکمل نہیں ہو پا رہی، نتیجہ نہیں نکل رہا، اور گفت گو کا سرا سامنے ہونے کے باوجود ہاتھ آتا دکھائی نہیں دیتا۔ مختلف وفود بارگاہ نبوت میں اپنی شرائط کے ساتھ آتے ہیں، اور بحث کو طول دے کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں ایک وقت ایسا آیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سامنے سے حلیس بن علقمہ نامی ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا تو صحابہ کرام سے فرمایا:

ہذا فلان، وہو من قوم یعظمون البدن، فابعثوہا لہ (١)

یہ فلاں شخص آ رہا ہے، اس کا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے، جو قربانی کے جانوروں کا احترام کرتی ہے، سو تم اپنے قربانی کے جانور اس کے سامنے کر دو۔

چناں چہ صحابہ کرام نے اسی طرح کیا۔ چنانچہ روایت کے مطابق لوگوں نے قربانی کے جانور اس کے سامنے سے گزارے اور تکبیر کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ جب اس نے قربانی کے جانوروں کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اور کہنے لگا کہ سبحان اللہ! ایسے لوگوں کو کعبے سے روکنا مناسب نہیں۔ پھر وہ لوٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ میں قربانی کے جانور دیکھ کر آیا ہوں، ان کی گردنوں میں قلادے

١۔ بخاری: کتاب الشروط، باب ١٥، حدیث ٢٧٣١

پڑے ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہوا ہے، میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکا جائے۔(۱)

دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے کہ قریش نے اس کی گفت گو سن کر اس سے کہا کہ بیٹھ جا، تو جنگلی ہے، تجھے کچھ پتہ نہیں۔ حلیس کو اس پر بہت غصہ آیا اور کہنے لگا ہمارا تمہارا معاہدہ نہیں ہے اور نہ ہمارا آپس میں اس بات پر حلف اور معاہدہ تھا کہ خدا کے گھر سے اس شخص کو روکا جائے گا جو اس کی تعظیم کے ارادے سے آئے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں حلیس کی جان ہے تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو موقع دو کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں، ورنہ میں تمام حبشیوں کو لے کر تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ قریش کو یہ دھمکی سن کر اپنی غلطی کا احساس ہوا اور قریش نے کہا کہ اچھا خفا نہ ہو ہم اس پر ذرا غور کر لیں۔(۲)

یہ واقعہ ہمارے لیے درس سیرت بھی ہے اور درس عبرت بھی۔ اس واقعے میں درس یہ پوشیدہ ہے کہ حالات اور واقعات کو دیکھ کر، ان کے پس منظر سے آگہی پا کر اور مدمقابل شخصیت کے خیالات جان کر ہی اپنے لیے لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔ حکمت عملی اسی کا نام ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہر جگہ، ہر ماحول میں، ہر مقام پر یکساں انداز اختیار کیا جائے اور حکمت اور مصلحت کو تج دینے بل کہ بالائے طاق رکھ دینے کو ہی ایمانی جذبے کی علامت تصور کر لیا جائے۔ اور یوں بھی نہیں ہونا چاہیے کہ بغیر کسی تیاری، بغیر کسی منصوبہ بندی اور بغیر کسی حکمت عملی کے دھاوا بول دیا جائے اور پھر حسب دل خواہ نتائج نہ نکلنے کی ذمے داری حالات یا کسی خود ساختہ یا حقیقی مخالف پر ڈال کر اپنے آپ کو قطعی طور پر بری الذمہ قرار دے دیا جائے۔ حکمت سے کام لینا مومن کی پہچان بھی ہے، اور اس کی عادت بھی۔ نتائج صرف، اور صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، مگر نتائج و ثمرات سے پہلے ذہن کی تیاری، اس میں تخم ریزی اور بیج بونا، پھر فصل کی تیاری، نگہ داشت، اور اس کی پرورش و پرداخت سب کا سب ہماری ذمے داری ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی محنت کو دیکھتا ہے، پھر اپنی حکمت کے مطابق اس محنت کے

۱۔ بخاری: حدیث ۲۷۳۱۔ مسند احمد: ج ۵، ص ۴۳۲

۲۔ سیرت ابن کثیر: ج ۳، ص ۳۱۶۔ عیون الاثر: ج ۲، ص ۱۶۴

نتیجے میں ثمرات عطا فرماتا ہے۔ فصل خواہ کسی چیز کی ہو، سنت اللہ یہی ہے، جس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں۔

حکمت کی اہمیت تعلیمات نبوی میں مسلم ہے۔ حکمت تو نبوت کے بنیادی فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ ماسبق کے انبیائے کرام کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم نے انبیائے کرام کو دیے جانے والے ہدایا و عطایا کا ذکر کرتے ہوئے جس جزوِ مشترک کا تذکرہ کیا ہے، وہ حکمت ہے۔ حضرت داؤد کے ذکر میں قرآن حکیم نے فرمایا:

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ (۱)

اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا، اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور حکمت عطا کی اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اس کو سکھایا۔

حضرت ابراہیم کے خاندان کے ذکر میں ارشاد ہوا:

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ (۲)

سو بے شک ہم نے ابراہیم کے خاندان کو کتاب اور حکمت دی اور ہم نے ان کو عظیم سلطنت عطا فرمائی۔

حضرت لقمان کے بارے میں یہ بیان ہوا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ (۳)

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر کرتے رہو۔

اور تمام انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ

اور جب اللہ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمھیں کتاب حکمت

۱۔ البقرہ: ۲۵۱

۲۔ النساء: ۵۴

۳۔ لقمان: ۱۲

دوں۔(۱)

یہ تمام حوالے یہ سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ حکمت کی دولت اہم ترین نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوتی ہے اور جس کے بغیر کوئی بڑا کام انجام دینا ممکن نہیں۔

خود حکمت ہے کیا؟ امام راغب اصفہانی کہتے ہیں:

والحکمۃ إصابتہا الحق بالعلم و العقل فالحکمۃ من اللہ تعالیٰ معرفۃ الاشیاء وایجادھا علی غایۃ الاحکام من الانسان معرفۃ الموجودات وفعل الخیرات (۲)

اور حکمت علم اور عقل کے ذریعے حق بات کو پہنچنا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کو جاننا اور ان کو نہایت خوبی کے ساتھ پیدا کرنا ہے۔ اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھے کاموں کا کرنا ہے۔

الحکمۃ الدین الذی لایعرفونہ الا بہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاھا (۳)

حکمت وہ دینی احکام ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں۔

ابن قتیبہ کہتے ہیں:

ھی العلم والعمل ولایکون الرجل حکیما حتی یجمعھما (۴)

علم اور اس کے مطابق عمل کرنے کا نام حکمت ہے اور کوئی شخص اس وقت تک حکیم نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔

مگر یہ وہ دولت ہے جس کے اثرات تک آج ہمارے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔ ایسے میں ہم کیسے مستقبل بینی کر سکتے ہیں؟ کیسے خواب دیکھ سکتے ہیں؟ اور کس طرح ان خوابوں کو تعبیر عطا

۱۔ آل عمران: ۸۱

۲۔ المفردات: ص ۱۲۷

۳۔ تفسیر جامع البیان: ج ۱، ص ۶۴۴

۴۔ خطیب: ج ۱، ص ۱۷۰

کر سکتے ہیں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ صلاحیتوں کی حفاظت اور ان کا درست استعمال حکمت کے بغیر ممکن۔ عرصے سے، جب سے حکمت کی جگہ محض خام جذبات نے لی ہے، صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ ہم محض جذبات کے اسیر ہیں، وہی ہمارا رہ نما ہے، جو جذبات کا بیوپار کر رہا ہے، اور وہی ہمارے قبلے کا فرد ہے، جو بڑھ بڑھ کر جذبات کی نیلامی میں شریک ہے۔

رہی حکمت اور تدبیر غور و فکر اور منصوبہ بندی ہو اس کے لیے غیر مسلم کیا کم ہیں؟ اس لیے یہ ہمارے ہاں اب چلنے والا سکہ نہیں۔ ایمان کے منافیز چیز سازش اور شرارت ہے، حکمت نہیں۔ حکمت تو متاعِ مومن اور میراث مسلمانان ہے۔

ایفائے عہد

عبداللہ ابن ابی حمسا رضی اللہ عنہ ایک صحابی رسول ہیں، ان سے رسول اکرم ﷺ کے زمانۂ قبل از بعثت سے تعلقات تھے، ان کا ایک واقعہ ہے۔ بعثت مبارکہ سے قبل آپ ﷺ نے ان سے خرید وفروخت کا کوئی معاملہ کیا، عبداللہ بن ابی حمسا کے ذمے کچھ ادائیگی باقی تھی، انہوں نے کہا کہ میں گھر سے لے کر آتا ہوں، آپ یہیں ٹھہریے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں ٹھہر گئے، مگر حضرت عبداللہ گھر جا کر اپنا وعدہ بھول گئے، تین روز بعد انہیں یاد آیا، وہ اس جگہ پر پہنچے تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انتظار میں اسی جگہ کھڑے ہیں، آں حضرت ﷺ نے اس قدر تاخیر کے باوجود صرف اس قدر فرمایا:

یافتی لقد شققت علی، انا ہہنا منذ ثلاث انتظرتک (۱)

اے نوجوان! تم نے مجھے سخت مشقت میں ڈال دیا، میں تو تین روز سے تمہارا یہیں انتظار کررہا ہوں۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ کیجیے، سب لوگ جانتے ہیں کہ جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی افرادی قوت بہت کم تھی اور مسلمانوں کو کمک کی بہت ضرورت تھی مگر میدان جہاد میں بھی دشمن کے مقابلے میں اور دشمن بھی وہ جو آپ کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلند ترین اخلاقی معیار کو پورے اعزاز کے ساتھ برقرار رکھا، اس موقع پر دو اصحاب رسول حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو حسیل رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)، ہم مکے سے آرہے ہیں راستے میں

۱۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۳۲۷، رقم ۴۹۹۶

مشرکین نے ہمیں گرفتار کرلیا تھا اور اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم لڑائی میں آپ کا ساتھ نہیں دیں گے، مگر یہ مجبوری کا عہد تھا، ہم کافروں کے خلاف ضرور لڑیں گے، مگر نبی رحمت ہادی اعظم ﷺ نے فرمایا:

انصرفا، نفي لهم بعهدهم، ونستعين الله عليهم (۱)

تم میدان جنگ سے واپس چلے جاؤ، ہم ہر حال میں ان سے اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے، اور ہمیں صرف خدا کی حمایت و مدد درکار ہے۔

عین میدان جنگ میں رسول خدا کی ہم رکابی اور دشمنان دین سے لڑنے کی خواہش رکھنے والے فرزندان توحید کو اپنے دشمن سے بہ امر مجبوری کئے گئے وعدے کی پاسداری کی تلقین، جبکہ عددی طور پر دشمن کے مقابلے میں بہت کم ہونے کے سبب اس وقت ایک ایک فرد کی اہمیت تھی، یہ سب رسولِ اکرم ہادی اعظم ﷺ کے نبیٔ اخلاق ہونے کی واضح مثال نہیں تو اور کیا ہے؟

ایسے چند ایک نہیں کتنے ہی واقعات آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا حصہ ہیں، لیکن اس نبی آخر الزمان کی امت کا اس حوالے سے کردار نا قابل رشک ہے۔ دیدہ زیب کرسیوں پر متمکن اور شاہی لباسوں سے مزین طبقۂ اشرافیہ کے کردار ہوں یا روز کی روزی تازہ کرنے والے۔ علم و فضل کی یہ دولت نمایاں نظر آنے والے صاحبان فضل و کمال ہوں یا کوئی مجھ ایسا جاہل۔ بات جب ایفائے عہد کی، وعدے نبھانے اور عہد پورے کرنے کی آتی ہے تو ہر طبقۂ فکر و عمل سے تعلق رکھنے والے تمام ہی محمود و ایاز (الا ماشاء اللہ) ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اور وہ صف ہے پختہ عہد توڑنے اور سچے وعدے پورے نہ کرنے کی۔ ہر وہ شخص جو دوسروں کو اس بنیاد پر قابل ملامت قرار دے رہا ہوتا ہے کہ اس نے وعدہ پورا نہیں کیا اور عہد شکنی کی ہے، دوسرے ہی لمحے وہ خود اس عمل شنیع پر عمل پیرا ہو کر خود اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو نقصان پہنچانے اور اس کے لئے ذہنی کوفت کا باعث بن رہا ہوتا ہے۔

ایک دین دار، پابند صوم و صلاۃ شخص سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ایفائے عہد سمیت

۱۔ مسلم: ج ۳، ص ۱۵۹، رقم ۱۷۸۷

تمام اخلاقی معاملات میں بھی اپنا کردار اسی طرح بلند رکھے گا، جس طرح وہ عبادت کے معاملات میں محض توفیق خداوندی سے اوروں سے نمایاں وممتاز نظر آتا ہے، مگر واسطہ پڑنے پر ہر شخص کو اس معاملے میں مایوسی ہوتی ہے اور ان امور میں ہر طبقے کے افراد کے مابین مکمل ہم آہنگی اور کامل مساوات نظر آتی ہے۔ سب ہی اس امر کے خواہاں نظر آتے ہیں کہ ان سے کیا جانے والا وعدہ بہر صورت پورا کیا جائے، اور سب ہی کی حتی المقدور یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے کیا ہوا عہد، معاہدہ اور وعدہ پورا نہ کریں۔

یہ معاشرتی اور اخلاقی برائی اور انسانی خامی تو ہے ہی سب سے بڑھ کر یہ ایمانی کم زوری اور دینی کوتاہی بھی ہے۔ ہر وہ شخص جو عبادات سمیت دیگر تمام دینی معاملات پورے اہتمام سے ادا کرتا ہے اور فرائض وسنن کے ساتھ ساتھ مستحبات تک کامل اخلاص سے بجالاتا ہے مگر اخلاقیات کے شعبے میں اس کی تمام سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں، تو اسے جان لینا چاہیے کہ اس کا نہ دین مکمل ہے، نہ ایمان کامل ہے، اور یہ اس حقیر محرر کا فتویٰ نہیں، ہادی برحق علیہ الصلاۃ والسلام کا اعلان ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً اپنے ہر خطبے میں دہرایا کرتے تھے کہ:

لا دین لمن لا عهد له (۱)

اس کا دین کامل نہیں، جو عہد کی پاس داری نہیں کرتا۔

لہٰذا مجھ سمیت ہر وہ شخص جو اپنے دین کی تکمیل اور ایمان کے کمال کا خواہش مند ہے، اسے عہد اور وعدے کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تمام اخلاقی خوبیوں سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا ہوگا کہ یہ بھی دین کا حصہ ہے اور اس کے بغیر ایمان اور دین کی تکمیل ممکن نہیں۔

ایفائے عہد کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآنِ حکیم میں اسے مومنین کی اولین صفات میں شمار کیا گیا۔ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ (۲)

وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔

۱۔ احمد: ج ۳، ص ۵۹۴، رقم ۱۱۹۷۵

۲۔ المومنون: ۸

اور دوسرے مقام پر ایفائے عہد کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ (۱)

اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں ایک دوسرے سے اقرار کرلو تو اس کو پورا کرو، اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کو تم نے اپنے اوپر ضامن ٹھہرایا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے۔

۱۔ النحل: ۹۱

حسنِ معاملہ

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب سرزمین عرب کو اسلام کی ضیا پاش کرنیں منور کرنے لگیں تو ہم چند افراد مقام ربذہ سے نکلے اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے، شہر کے قریب پہنچے تو وہیں پر قیام کیا۔ ہم وہیں بیٹھے تھے کہ ایک سفید پوش نیک صورت صاحب آئے، خیریت معلوم کی، ہم نے سلام کا جواب دیا، ہمارے پاس سرخ رنگ کا ایک اونٹ تھا، اس کی قیمت معلوم کی، ہم نے جواب دیا کہ اس قدر کھجور کے بدلے میں لے سکتے ہیں، انہوں نے کچھ بھاؤ تاؤ اور مول تول نہیں کیا، ہماری بتائی ہوئی قیمت قبول کرلی اور اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے لے کر شہر کی طرف لے چلے، اور بالآخر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ جب آپ واپس جا چکے تو ہم لوگوں کو احساس ہوا کہ دام تو لیے نہیں اور ہم انہیں پہچانتے بھی نہیں، اس لیے دام تو گئے، اب لوگوں نے ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہرانا شروع کیا اور عام رواج کے مطابق صورت حال کی ذمے داری ایک دوسرے پر ڈالی جانے لگی، ایسے میں ایک محمل نشین، پردہ دار خاتون بولیں کہ مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کے مانند اس قدر روشن نہیں دیکھا، یعنی ایسے شخص کے بارے میں بدگمانی درست نہیں، یہ شخص کوئی دغا نہیں کرسکتا۔

رات ہوئی تو اس خاتون کا دعویٰ درست ثابت ہوگیا، ایک شخص آیا اور اس نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہارے لیے کھانا اور کھجور بھیجی ہیں، دوسرا دن ہوا، صبح کے وقت ہم لوگ شہر مدینہ میں داخل ہوئے اور مسجد نبوی پہنچے اس وقت آں حضرت ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور خطبہ ارشاد فرمارہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک انصاری صحابی اٹھے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ لوگ قبیلہ بنوثعلبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے جداعلیٰ نے ہمارے خاندان کے

ایک فرد کو قتل کر دیا تھا، اس کے بدلے میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجیے، نبی رحمت ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا۔(۱)

اس پاکیزہ، مطہر و طاہر اور فروزاں و درخشاں آئینے میں، اب ہمیں اپنی تصویر دیکھنی ہے۔ وہ نبی اول و آخر، جس کی نسبت سے ہمیں یہ شرف عظیم بھی حاصل ہوا کہ ہم امت خاتم ہیں اور وہ خاتم النبیین ہیں، اور اسی نبی ہادی علیہ الصلاۃ والسلام جس کی بابت رب کائنات کا یہ حکم ہے کہ اس نبی کامل کی ذات والاصفات میں ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے، اسی کے امتی ہونے کے باوجود صرف اس ایک واقعہ مذکورہ کی روشنی میں اگر ہم اپنے کردار کا جائزہ لیں تو کیا صورت سامنے آتی ہے؟ یہی کہ کہاں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے کہ ان کے چہرۂ انور کی صرف ایک جھلک دیکھنے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و امانت پر ایمان لے آتے تھے اور کہاں ہم ہیں کہ بدعنوانی کی وہ کون سی نوع ہے، کرپشن کی وہ کون سی شکل ہے اور بدمعاملگی کی وہ کون سی قسم ہے جو ہماری دست رس سے باہر ہے؟ بدعنوانی کا وہ کون سا جزیرہ ہے جو آج تک ہمارے دم قدم سے آباد نہ ہوا ہو؟ جہاں ابھی تک ہمارے قدم نہ پہنچے ہوں؟ اور اس کی مٹی کو ہمارے پیروں نے ہنوز نہ روندا ہو؟ کوئی طبقہ زیست اور کوئی مکتبہ فکر ایسا نہیں جو دل تھام کر سینہ تان کر یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کی صفوں میں کالی بھیڑوں کی کوئی گنجائش نہیں، اس کے پہلوؤں میں کوئی بدعنوان شخص موجود نہیں، اس کے ہاتھ اور دامن اس طرح صاف ہیں، جیسا کہ اس کے سفید کلف دار کپڑے بے داغ بے شکن ہیں۔

ہمارے دین کے بہت حصے ہیں مگر معاملات اور مالی امور شاید دین کا اب حصہ نہیں رہے، ایک آدمی شاید آج معاملات کا کھوٹا اور معاشرت کا کمزور ہونے کے باوجود پختہ کار مسلمان ہو سکتا ہے اگر وہ چند عبادات کو ظاہری اہتمام سے ادا کرتا ہو، دین میں یہ عملی تحریف نہ جانے کب ہوئی، لیکن ہوئی اس قدر خاموشی سے ہے کہ کسی کو علم تک نہیں ہو سکا، کہیں سے اس پر آواز بلند نہیں ہوئی کسی نے اس بارے میں علما سے رجوع نہیں کیا، مفتیان کرام سے فتویٰ نہیں مانگا، اور اگر ایک آدھ آواز بلند ہوئی بھی تو وہ بھی اب ایک طویل عرصے سے خاموش ہے۔

۱۔ الدار قطنی: ج ۲، ص ۳۰۷

استغفر اللہ العظیم۔

خدا کا کلام اگر سچا ہے اور یقیناً سچا ہے، خدا کا رسول اگر مثال ہے اور یقیناً وہ مسلمانوں کے لیے ایک مثال اور عملی نمونہ ہے تو پھر ان کا دین اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک عبادت اور معاملات میں یک رنگی حاصل نہیں ہوتی۔ تصویر اس وقت مکمل ہوگی، جب اس کے سارے اجزا بہم ہوں گے۔ اور ایسا کرنا ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہے، ہر اہم کام کی طرح۔
خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

صلہ رحمی

امیر المؤمنین خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمات اور مقام و مرتبے سے کون واقف نہیں؟ ان ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بار ان کے ایک قریبی عزیز منافقین کی سازش کا شکار ہو گئے اور نادانستگی میں ایک ایسی عظیم غلطی سرزد ہوئی کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوگئی۔

واقعہ افک کا ذکر ہے۔ چوں کہ اس واقعے سے بہ راہ راست متاثر ہونے والوں میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، اور وہ اپنے ان عزیز کی کفالت بھی کرتے تھے، اس لیے آپ کا رنج و غم فطری تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھائی کہ اب میں ان کی کفالت نہ کروں گا۔ یہ واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ اور قرآنی احکام کا ایک حصہ بن گیا ہے اور اس طرح کہ آج قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے سامنے جب یہ آیت کریمہ آتی ہے، جس کا ترجمہ آگے بیان ہو رہا ہے، تو اس واقعے کی پوری تاریخ اس کے سامنے پھر جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قسم اٹھانے کے بعد قرآن حکیم میں اللہ عزوجل کی جانب سے حکم نازل ہوا:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢﴾ (۱)

۱۔ النور: ۲۲

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل و قدرت ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتے داروں، مساکین اور مہاجرین فی سبیل اللہ کی مدد نہیں کریں گے، انہیں تو معاف کر دینا چاہیے اور درگزر سے کام لینا چاہیے، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے اور اللہ تو غفور و رحیم ہے۔

رحم و کرم تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص صفت تھی اور اس کے اظہار کے مواقع متعین نہ تھے، رحم و کرم کا معاملہ اور عفو و درگزر کا سلسلہ دربار نبوی میں عام تھا، لیکن صلہ رحمی، دشمنوں سے حسن سلوک، اپنوں پر نوازشیں اور غیروں کو اپنا لینے والا احسان، اور جود و کرم کے مظاہر تو کسی اور مقام پر نظر آ ہی نہیں سکتے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ صلہ رحمی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زور دیا ہے اور متعدد مقامات پر اس کی تاکید فرمائی ہے۔ اور آج یہ صفت ہمارے درمیان سے کچھ اس طرح سے رخصت ہو رہی ہے کہ اس کے لوٹ جانے کا نشان تک نظر نہیں آتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ رحم انسانی، عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے:

من وصلنی وصلہ اللہ، و من قطعنی قطعہ اللہ (۱)

جو مجھے ملائے، اسے خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے، اسے خدا کاٹے۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا یدخل الجنۃ قاطع رحم (۲)

جو شخص صلہ رحمی نہ کرے (یعنی قرابت داروں کا حق ادا نہ کرے) وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یہ تاکید، یہ مبالغہ پھر اس کے ساتھ ساتھ اس قدر سخت وعید کس لیے ہے؟ کیا ہم اپنے آس پاس، دائیں بائیں اور اڑوس پڑوس میں نہیں دیکھتے کہ بھائی بھائی سے لڑ رہا ہے، خاندان کے اگر چار کونے ہیں، تو چاروں باہم دست و گریباں ہیں۔ نہ ایک دوسرے کے

۱۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۶۷، رقم ۲۵۵۵

۲۔ بخاری: کتاب الادب، باب ۱۱۔ مسلم: ایضاً، رقم ۲۵۵۶

حقوق کی رعایت رکھی جا رہی ہے نہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض کا خیال ہے، اور تمام تر جھگڑے کی بنیاد ان مادی چیزوں پر ہے جن کا وجود خود فانی ہے اور اس قدر عارضی ہے کہ خود انسان کی ذات کے مقابلے میں بھی ہیچ ہے۔ اس بنا پر اگر ان معاملات کو سلجھا لیا جائے تو اس خطۂ آب و گل کی کتنی ہی رونقیں لوٹ سکتی ہیں، کتنے ہی مسائل ختم ہو سکتے ہیں اور کتنے ہی مصائب کے سوتے خشک ہو سکتے ہیں۔ تعلیمات نبوی ﷺ کے ایک اہم حصے کا صلہ رحمی پر مشتمل ہونے کا یہی سبب ہے۔

آج انسان اپنے رزق اور عمر دونوں کی جانب سے غیر یقینی اور مسلسل پریشانی کا شکار ہے، درحقیقت یہ دونوں چیزیں انسان کی پسندیدہ چیزیں ہیں، وہ اپنے رزق میں بھی وسعت کا خواہاں ہوتا ہے اور عمر طویل کا طلب گار بھی نظر آتا ہے، لیکن شاید اسے معلوم نہیں کہ اس کا اصل حل کیا ہے؟ حال آں کہ اسے معلوم ہونا چاہیے اور خصوصاً ایک صاحب ایمان سے یہ حقیقت قطعاً پوشیدہ نہیں ہونی چاہیے کہ انسان کی عمر و رزق میں اضافے و برکت کا وظیفہ کیا ہے؟ کیوں کہ ہادی برحق، ہادی اعظم ﷺ نے ایک زمانہ قبل اس حقیقت کے چہرے کی نقاب کشائی فرمادی تھی، یہ فرما کر:

> من سره ان یبسط علیه رزقه، اوینسأفی اثره فلیصل رحمه (۱)
>
> جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور عمر میں برکت ہو جائے تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔

اب وہ کون شخص ہوگا جو یہ نہیں چاہے گا کہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں برکت ہو، مگر اس کے حصول کے طریقۂ کار کی طرف آنے والے کتنے ہیں؟ ہم سب ہی اس باب میں اصلاح کے محتاج ہیں اور اس اعتبار سے ہماری جو کیفیت ہے، اس سے خود ہم سے زیادہ کون واقف ہوگا؟ اور سب سے افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس باب میں بھی اور اخلاقی کمزوریوں کی طرح ہم میں کسی طرح کی کوئی تخصیص نہیں، صاحب مسجد و مصلیٰ بھی اسی طرح پچھلی صفوں میں کھڑے ہیں، جیسا کہ ہم ایسے کم علم و بے عمل۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اخلاقیات کے اور عنوانات

۱۔ مسلم: ایضاً، رقم ۲۵۵۷۔ بخاری: کتاب البیوع، باب ۱۳

کی طرح اسے بھی ہم نے عبادت کے مفہوم سے خارج کر رکھا ہے، حال آں کہ یہ دعویٰ بھی ہمارا ہی ہے کہ ہمارا دین، دین فطرت ہے اور ہر لحاظ سے کمال و جمال کا مرقع۔

اسی حوالے سے ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں صلہ رحمی کا تصور بھی حد درجہ ناقص ہے، ہم صلہ رحمی یہ سمجھتے ہیں کہ جو ہم سے ملے ہم اس سے ملیں، جو ہمیں بلائے، ہم اسے بلائیں، جو ہمیں تحائف دے، ہم اسے نوازیں۔ یہ بھی صلہ رحمی ہے، مگر اس کا صرف ایک حصہ ہے، اصل صلہ رحمی یہ ہے جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا:

صل من قطعک واعط من حرمک واعرض عمن ظلمک (۱)

جو تم سے توڑے، تم اس سے جوڑو اور جو تمہیں محروم کرے تم اسے دو، اور جو تم پر ظلم کرے، تم اس سے اعراض کرو۔

دینے والے کو تو سب ہی دیتے ہیں، ملنے والوں سے تو سب ہی ملتے ہیں، مزا تو جب ہے کہ توڑنے والوں سے ملا جائے، نہ دینے والوں کو دیا جائے اور غریب و مستحق رشتے داروں کی اعانت اور حسب توفیق مدد بھی صلہ رحمی کا حصہ ہے اور ہم سب کا فرض ہے۔ خدا کرے کہ ہم سب اس فرض کو ادا کر سکیں، آمین۔

۱۔ مسند احمد: ج ۵، ص ۱۴۳، رقم ۱۶۸۸۳

ایثار

اخلاق حمیدہ میں سے ایک ایثار بھی ہے، اور حضور اکرم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جس اسوۂ حسنہ اور خلق عظیم کی اتباع کی ہمیں تاکید کی گئی ہے، ایثار کی صفت بھی اس کا ایک اہم جز ہے۔ ایثار کیا ہے؟ ایثار دوسروں کی ضرورتوں کو اپنے اوپر ترجیح دینے اور انہیں اپنی ضرورتوں پر فوقیت دینے کا نام ہے خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانا، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانا۔ اس اعتبار سے یہ جود وسخا اور فیاضی کا اعلیٰ ترین اور سب سے آخری درجہ ہے۔

ایثار بھی دوسری صفات حسنہ کی طرح ایمان کی پہچان اور مومن کا شعار ہے، اس کی حیثیت محض اتنی ہی نہیں، یہ تبلیغ دین کا بھی ایک موثر ترین ذریعہ ہے۔ جب انسان کسی دوسرے شخص کی مشکل وقت میں مدد کرتا ہے، تو اس کے دل میں یقیناً اپنے لیے نرم گوشہ بھی پیدا کر لیتا ہے، پھر جب مدد اور تعاون ایثار کے درجے میں ہو، تو اس کا تاثر زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتا ہے، اس معاملے کا یہی ایسا پہلو ہے جو ہمارے لیے دور جدید اور عصر حاضر میں اہم ہے اور ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے، خصوصاً اس کے دعوتی پہلو سے پہلو تہی اور صرف نظر کیا جا رہا ہے، حال آں کہ ابتدائے اسلام میں فروغ اسلام میں اس صفت نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایثار کے حوالے سے انصارِ مدینہ کا کردار نہایت اہم ہے۔ اسی لیے قرآنِ حکیم نے بھی ان کے جذبے کو سراہا اور اسے قابلِ تقلید قرار دیا۔

جب بنو نضیر کی زمین مسلمانوں کے قبضے میں آئی اور اس کا بڑا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے انہیں عطا کر دیا تو انصار نے اس فیصلے کو نہایت خوش دلی سے قبول کیا۔ قرآنِ حکیم میں ان کے اس جذبے کی ستائش کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ (۱)

اور ان لوگوں کے لیے جو مہاجرین سے پہلے ہجرت کے گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش اور خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے لوگ ہی مراد پانے والے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص کو آں حضرت ﷺ نے دو پہاڑوں کے درمیان پھیلا ہوا ریوڑ عنایت فرمایا، وہ اس امر سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اپنی قوم میں جا کر کہنے لگا:

یا قومی اسلموا، فان محمداً یعطی عطاءً لا یخشی الفاقة (۲)

اے لوگو! اسلام لے آؤ کیوں کہ محمد (ﷺ) اتنا دیتے ہیں کہ وہ اپنے فقیر ہونے کی بھی پروا نہیں کرتے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کے علاوہ ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں، جب آپ نے دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی حاجتوں پر ترجیح دی اور خود بھوکے رہ کر دوسروں کو نواز دیا ان واقعات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں یعنی صحابہ کرام سے ہے، مگر اس میں کوئی تفریق نہیں تھی، جیسا کہ اوپر بیان ہونے والے واقعے سے اندازہ ہوتا ہے۔

ایک بار ایک صحابی رسول ﷺ نے شادی کی، ولیمے کے لیے گھر میں کچھ سامان نہ تھا، رسول خدا ﷺ کو علم ہوا تو فرمایا کہ جاؤ اور عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے آٹا مانگ لاؤ، وہ گئے

۱۔ الحشر: ۹

۲۔ مسلم: ج ۴، ص ۳۵ ۵، رقم ۲۳۱۲

اور آٹا لے آئے۔ راوی کا بیان ہے کہ کاشانہ نبوت میں اس روز اس آٹے کے علاوہ شام کو کھانے کو کچھ نہ تھا۔(۱) اور وہ بھی ایک ضرورت مند کو دے دیا گیا تھا۔

ایسے ہی ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار ایک غفاری قبیلے کا شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آ کر مہمان ہوا، اس رات کاشانہ نبوت میں رات کے کھانے کی جگہ صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مہمان کی نذر کر دیا اور نبی رحمت کے ہاں اس رات فاقہ رہا، ہمارے لیے مقام تفکر یہ ہے کہ اس سے پہلی شب میں بھی خانہ نبوت میں فاقہ ہی تھا۔(۲)

ایثار کی ایک اس سے بھی بڑھ کر اعلیٰ قسم ہے کہ انسان اپنے اہل خانہ اور قریبی متعلقین کی جائز ضرورتوں پر عام لوگوں کی ضرورتوں کو ترجیح دے، نبی اول وآخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کے بھی عمدہ عملی نمونے ملتے ہیں۔ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی امر کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست رد کر دی اور فرمایا:

لا اعطیکم و ادع اہل الصفۃ، تلوی بطونہم من الجوع (۳)

یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تم کو تو دے دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں۔

ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے ہم راہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ حضرت فاطمہ کے چکی پیستے پیستے اور آٹا گوندھتے گوندھتے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ حالیہ غزوے کے مال غنیمت میں جو لونڈیاں آئی ہیں، ان میں سے ایک دو مل جائیں، باوجودے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ آپ کی صاحب زادی کس حالت اور فاقہ کشی و تنگ دستی کی کس کیفیت سے دو چار ہیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست قبول نہیں فرمائی، اور فرمایا:

۱۔ احمد: ج ۴، ص ۶۵۵، رقم ۱۶۱۴۱

۲۔ احمد: ج ۷، ص ۵۴۴، رقم ۲۶۶۸۴

۳۔ احمد: ج ۱، ص ۱۲۸، رقم ۵۹۷

واللہ لا اعطیکما وادع اھل الصفة تطوی بطونھم، لا اجد ما انفق علیھم، ولکنی ابیعھم وانفق علیھم اثمانھم (۱)

خدا کی قسم میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں کیسے دے دوں، حال آں کہ اہل صفہ بھوکے بیٹھے رہیں۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان پر خرچ کر سکوں، لیکن میں ان غلاموں کو بیچوں گا اور ان کی رقم اہل صفہ پر خرچ کروں گا۔

ایک جانب سیرت طیبہ کے یہ روشن واقعات ہیں اور دوسری جانب ہمارے تاریک اعمال اور ظلمتوں سے بھرے ہوئے طور وطریقے، جہاں ہر برائی بلا دلیل رواج پا سکتی ہے، مگر کسی اچھائی کو بار نہیں مل سکتا، صفت ایثار بھی ہمارے اسی طرز عمل کا شکار ہے۔

اوپر کی سطور میں جو واقعات ذکر کیے گئے وہ تو بہت زیادہ اعلیٰ درجے کے ہیں، مگر ہم تو عام نوعیت کے معاملات میں بھی دوسروں کا حق مار کر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو تکلیف پہنچا کر ہمیں راحت ملتی ہے۔ اگر سڑک پار کرتے ہوئے بزرگ، خواتین اور بچوں کو دیکھ کر ہم اپنی گاڑیاں روک لیں تو ہمیں کتنے لمحات کی قربانی دینی ہوگی؟ اگر بل جمع کراتے ہوئے ہم قطار بنا لیں تو سوچیے کہ فائدہ آخر کس کو ہوگا؟ اگر آج آپ بغیر قانون کے گاڑی آگے بڑھا کر لے جاتے ہیں اور ساتھ والی گاڑی کو اس کے استحقاق کے باوجود راستہ نہ دے کر خوش ہوتے ہیں تو ذرا دل تھام کر سوچیے کہ کل یہ صورت حال آپ کے ساتھ پیش آ جائے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟ غلط اوورٹیک کرنا، غلط جگہوں پر گاڑی پارک کرنا اور غلط راستے سے اپنی گاڑی نکال لینا بھی اس قسم کے معاملات ہیں، یہ تمام امور تھوڑا سا تحمل اور تھوڑا سا ایثار چاہتے ہیں۔ اگر ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ ان تمام جگہوں پر تھوڑے سے تحمل اور تھوڑے سے ایثار کا مظاہرہ کرنے میں نہیں ہچکچائیں گے تو ہماری زندگی کے تقریباً چالیس فیصد لمحات خوشگوار ہو سکتے ہیں، اتنے ہی فیصد ذہنی دباؤ اور پریشانی سے ہم نجات حاصل کر سکتے ہیں اور ہمارا وقت کس قدر بچتا ہے، یہ تجربے اور عمل ہی سے معلوم ہوگا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس ایثار کا درس ہمیں سیرت طیبہ سے مل رہا ہے، وہ خود

۱۔ احمد: ج ۱ ص ۱۷۱، رقم ۸۴۰

ہمارے لیے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے مذہب کا بھی حصہ ہے، سو کم از کم وہ حضرات جو دین کے ماشاء اللہ بہت سے پہلوؤں پر نہایت دل جمعی، خشوع وخضوع اور نہایت اہتمام سے عمل پیرا ہوتے ہیں اگر اس پہلو کو بھی نظر انداز نہ کریں تو کم از کم ۲۰ فیصد معاشرہ تو ایثار پسند خود ہی ہو جائے۔

اوپر صرف چند بنیادی پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایثار ایسی ہمہ جہت صفت ہے کہ زندگی کے ہر شعبے سے اس کا تعلق نکلتا ہے، غور وفکر کے در وا کیجئے اس کی عملی صورتیں خود بخود آپ کے سامنے آتی چلی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی راہ آسان فرمائیں، آمین۔

دوسروں کے کام آنا

اپنے کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دینا بھی اچھی اور محمود صفت ہے، لیکن یہ تو ہمارے معاشرے میں عام طور پر ہوتا ہی ہے، صرف اعلیٰ طبقے اور قائدین کی کلاس کے لیے یہ بات اہمیت رکھتی ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر اور صحیح معنی میں کرنے کا کام یہ ہے کہ انسان دوسروں کے کام آئے اور حسبِ استطاعت اور حسبِ توفیق دوسروں کے کام کر کے خوشی محسوس کرے، جن کی ادائیگی سے بہ وجوہ وہ قاصر ہوں، یا وہ بہ سہولت وہ کام نہ کر سکتے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ ہمیں اس پہلو کو بھی روشن مثالوں اور قابلِ تقلید نمونوں سے روشن کرتا ہے۔

حبشہ سے رسول اللہ ﷺ کے پاس جو مہمان آتے تھے آپ ہمیشہ ان کی خود خدمت کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خواہش ہوتی کہ یہ کارِ خیر ہم انجام دیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ان کی خدمت میں خود کروں گا۔ کیوں کہ انہوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے۔(۱)

اس میں ہجرتِ حبشہ کی طرف اشارہ تھا، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے حکم پر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور قریش مکہ کے لالچ دینے، خوشامد کرنے اور سیاسی، سفارتی دباؤ ڈالنے کے باوجود شاہ حبش نجاشی نے نہ صرف انہیں قریش مکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا، بل کہ انہیں رہائش وغیرہ کی بھرپور سہولتیں دے کر انہیں اپنے مہمان کی حیثیت سے اپنے ہاں ٹھہرایا تھا۔

۱۔ زرقانی

اسی طرح حضرت خباب رضی اللہ عنہ ایک معروف صحابی ہیں، انہیں ایک بار آپ ﷺ نے کسی مہم کے سلسلے میں روانہ کیا، ان کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور نہ ان کے گھر کی خواتین کو دودھ دوھنا آتا تھا، اس لیے جب تک وہ واپس نہیں لوٹے، اس وقت تک آپ ﷺ پابندی سے ان کے ہاں جاتے اور دودھ نکالا کرتے تھے۔(۱)

رسول رحمت ﷺ کا یہ رویہ اور انداز مہربانی وخدمت گزاری صرف اپنے ساتھیوں، رفقا، خدام اور صحابہ کرام ہی کے ساتھ نہیں تھا، بل کہ آپ ﷺ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رکھتے تھے اور ان کے ساتھ بھی آپ کا برتاؤ اسی نوعیت کی مہربانی، ہم دردی اور خدمت گزاری والا ہوتا تھا۔ طائف کے اس سفر سے کون واقف نہیں؟ کفارِ ثقیف نے نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ سے تعاون نہیں کیا، بل کہ الٹا آپ ﷺ کی ایذادہی کے درپے ہوگئے اور آپ ﷺ کو اس قدر تکالیف دیں کہ آپ لہولہان ہوگئے۔ سن ۹ ہجری کا واقعہ ہے کہ یہی کفارِ ثقیف اپنا وفد لے کر آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس موقع پر آپ ﷺ نے خود ان کی خدمت کی، انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا، اور ان کی میزبانی کے فرائض بہ نفس نفیس ادا کیے۔(۲)

نبی کریم ﷺ کا یہ طرزِ عمل ہر ایک کے ساتھ بلاتفریق ہوتا تھا اور جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا اس میں کسی قسم کی تفریق نہیں فرماتے تھے۔ نہ تو مرد اور عورت کی بنیاد پر، نہ جان پہچان کی بنیاد پر، نہ معزز وغیر معزز کی بنیاد پر، بل کہ آپ ﷺ کا یہ ہم دردانہ اور تعاون وخدمت پر مبنی رویہ ان لوگوں کے ساتھ بھی تھا جو عقل وشعور کے اعتبار سے بھی کم زور حیثیت کے حامل تھے۔ اخلاقِ حسنہ، خلق عظیم اور عظمتِ انسانی کی یہ وہ معراج ہے، جس پر آپ ﷺ فائز تھے۔ ایک مرتبہ ایک خاتون نے جو مدینہ منورہ میں رہتی تھی اور اس کی ذہنی کیفیت درست نہ تھی، آپ ﷺ کی خدمت میں آکر کہا کہ محمد! مجھے تم سے کچھ کام ہے، آپ ﷺ نے اس کی بات کا نہ صرف یہ کہ برا نہیں منایا، بل کہ اسے کہا کہ جہاں تم کہو، میں جانے کے لیے تیار ہوں

۱۔ طبقات ابن سعد: ترجمہ خباب

۲۔ الشفاء

چناں چہ وہ آپ ﷺ کو کچھ دور لے گئی اور وہاں جا کر بیٹھ گئی، آپ ﷺ بھی وہیں اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور پھر اس کا جو بھی کام تھا وہ پورا کیا اور پھر واپس لوٹے۔ (۱)

اسی طرح ایک مرتبہ ایک بدو آیا اور آ کر اس نے پاسِ ادب کیے بغیر بدویانہ طریقے سے آپ ﷺ کا دامن مبارک تھام لیا اور کہا کہ میرا یہ کام رہ گیا ہے اسے آپ خود کر دیں، ایسا نہ ہو کہ میں اسے بھول جاؤں۔ آپ ﷺ اس وقت مسجد میں تھے اور جماعت تیار تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ اس کے ساتھ باہر نکل آئے اور اس کا مطالبہ پورا کیا، پھر نماز ادا کی۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اور حیاتِ طیبہ کے پورے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواہ اپنا کام ہو یا کسی اور کی کوئی خدمت، جب بھی کبھی ایسا کوئی موقع سامنے آتا تو آپ ﷺ اس کی ادائیگی کے لیے دوسروں سے پہلے کھڑے ہوتے اور نہ صرف یہ کہ اپنے صحابۂ کرام کے ساتھ اپنے لیے کسی قسم کا امتیاز پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے لیے ترجیحی بنیادوں پر کسی سلوک کے خواہش مند نہیں ہوتے تھے، بل کہ اس طرح کے ہر کام میں دوسروں سے بھی سبقت لے جاتے تھے۔ یہ صفت یقیناً انسانیت کی معراج ہے اور آپ ﷺ اکمل الخلق اور احسن الخلق ہونے کی وجہ سے اس معراج کی بھی آخری بلندی پر فائز تھے، لیکن آپ ﷺ کے عطا فرمودہ اسوۂ حسنہ اور راہِ عمل نے ہمیں بھی اس عمل کی تحریک بخشی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ دوسری اور بہت سی اچھی صفات کی مانند اس صفت سے بھی ہم دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اس بعد کی سب سے اہم وجہ ہمارا افسرانہ کلچر ہے، جس میں خود اٹھ کر پانی پینا تو کجا، سامنے میز پر رکھے ہوئے گلاس کو اپنے ہاتھوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ہونٹوں تک لانا بھی خلافِ شان تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اندازِ زیست ان سے منتقل ہو کر کلرکوں تک پہنچتا ہے، اور یہ کلاس جب اپنا آئیڈیل عملی طور پر کہیں نہیں پاتی تو گھر میں بادشاہی کے مزے لوٹتی ہے، اور اب دیکھا دیکھی یہ شان ہر طبقے کی کمزوری بن چکی ہے۔ نتیجتاً کوئی شخص بھی (الا ماشاء اللہ)

۱۔ ابوداؤد: ادب

۲۔ ابوداؤد: ادب

اپنی اپنی حدود اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں اس وقت تک کچھ کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا، جب تک کہ اس کے سر پر نہ آ پڑے اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار ہی نہ رہ جائے۔

یہ صورتِ حالات تو اپنے کام کے بارے میں ہے، رہا دوسروں کے کام آنا، تو اس کا تو تصور بھی امرِ محال ہے۔ بلا ضرورت اور بے لوث طریقے سے دوسروں کے کام آنے کا تخیل بھی عنقا ہو چکا ہے، اور کبھی کہیں کوئی ایسا موقع آ جائے تو سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے کہ ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ یہ سوداگرانہ ذہنیت ہماری ایک نہیں کئی ایک برائیوں کی جڑ ہے۔

خصوصیت کے ساتھ ہمارا مقتدر طبقہ جس میں حکمران، اہل ثروت، عمائدین، معززین اور سیاسی شخصیات بھی شامل ہیں اور اہل طریقت بھی اور اہل شریعت بھی یہ سب اگر یہ فیصلہ کر لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے، آج سے دن میں صرف ایک بار بے لوث طریقے سے کسی کے کام آئیں گے اور پھر اپنے اس نیک عمل کو اپنے ذہن سے مٹا دیں گے تو شاید چند ہی روز میں دوسروں کی شکایتیں کرنے والے خود ان کی شان میں رطب اللسان ہو جائیں۔

اس پہلو سے عمل کی راہیں منور کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت شاید ہمارے دین دار طبقے کو ہے، جس کی ذمے داریاں اس حوالے سے ویسے بھی دو چند ہیں اور ان کا یہ پہلو کئی اعتبار سے کم زور بھی ہے، سو کیوں نہ اس کارِ خیر کا اپنے آپ سے اور آج ہی سے آغاز کر دیا جائے۔

سچائی اور راست گفتاری

ایک روز رؤسائے قریش، مکہ مکرمہ میں جمع تھے اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر جاری تھا، نضر بن حارث نے جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ سب میں زیادہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہے، کہا:

انه والله قد نزل بكم، أمر ما أتيتم له بحيلة بعد، قد كان محمد فيكم غلاما حدثا، أرضاكم فيكم، وأصدقكم حديثا، وأعظمكم أمانة، حتى اذا رأيتم فى صدغيه الشيب، وجاء كم بما جاء كم به، قلتم ساحر، لا والله ماهو بساحر، لقد رأينا السحرة ونفثهم و عقدهم، وقلتم كاهن، لا والله ماهو بكاهن، قد رأينا الكهنة، و تخالجهم و سمعنا سجعهم، وقلتم شاعر، لا والله ماهو بشاعر، قد رأينا الشعر، سمعنا أصنافه كلها، هزجه و رجزه، وقلتم مجنون، لا والله ماهو بمجنون، لقد رأينا الجنون، فما هو بخنقه، ولا وسوسته ولا تخليطه، يامعشر قريش فانظروا فى شأنكم، فانه لقد نزل بكم أمر عظيم (۱)

اے قریش تم پر (دین اسلام کی تبلیغ اور رسول اکرم ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کی صورت میں) جو یہ نئی مصیبت آئی ہے، اس کی اب تک تم کوئی تدبیر نہیں نکال سکے، محمد (ﷺ) تمہارے سامنے چھوٹے سے بڑا ہوا، تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول، اور امانت دار تھا، اب جب اس کی جوانی ڈھلنے لگی، اور

۱۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۸

اس نے تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو اب تم کہتے ہو کہ وہ (نعوذ باللہ) ساحر ہے۔ خدا کی قسم وہ ساحر نہیں ہے، ہم سحر سے بھی واقف ہیں اور ان کے گرہوں میں پھونکنے وغیرہ طریقوں سے بھی۔ کبھی تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کو بھی دیکھا ہے اور ان کے طریقوں کا بھی علم ہے۔ کبھی تم کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے، خدا کی قسم وہ شاعر بھی نہیں ہے، ہم شعر کو بھی جانتے ہیں اور اس کی تمام اقسام کو بھی۔ اور کبھی تم کہتے ہو کہ وہ مجنون ہے، خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں ہے، ہم نے جنون بھی دیکھا ہے، اس کی اقسام کو بھی۔ اے اہل قریش تم اپنے معاملے پر غور کرو، تم پر یہ کوئی نئی مصیبت آئی ہے۔

گو کہ نضر بن حارث ہدایت الٰہی نہ ہونے کے سبب کلام الٰہی کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا، اور اس نے اسلام کی آمد کو ایک نئی مصیبت سے تعبیر کیا، لیکن اس قدر سچ کی اس نے ضرور گواہی دے دی کہ رسول خدا علیہ الصلوۃ والتحیۃ اپنی ولادت کے روز اول ہی سے چالیس برس تک قریش مکہ کے نزدیک کیا مقام و مرتبہ رکھتے تھے، اس میں بھی آپ کی دو صفات نمایاں تر نظر آتی ہیں، ایک صادق اور ایک امین یعنی صدق و امانت کے بنیادی خصائل تھے، اور دیکھا جائے تو باقی تمام خصوصیات اور صفاتِ حسنہ ان ہی دونوں صفات کے گرد گھومتی ہیں۔ اس نے بالفاظ دیگر قریش کو پیغام دیا تھا کہ جو شخص اپنی زندگی کے چالیس قیمتی اور پر ہنگام ترین برسوں میں مخلوق خدا کے بارے میں ایک حرف بھی غلط نہیں بولتا، ایک لمحے کے لیے بھی کذب بیانی سے کام نہیں لیتا، لحظہ بھر کو بھی ان کی چھوٹی چھوٹی امانتوں میں خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا، وہ خود خدا کے بارے میں کیسے غلط بیانی کر سکتا ہے؟ رب کائنات کی دی ہوئی امانت کے بارے میں کیوں کر خیانت سے کام لے سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عطا فرمودہ دولت کو کس طرح گنوا سکتا ہے؟ آج بھی یہ سوال غیر مسلموں کے سامنے پورے یقین کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے۔

پھر ایک اور نکتہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مشرکین عرب کا یہ خیال صرف بعثت مبارکہ سے پہلے تک نہیں تھا، بل کہ آپ کی بعثت اور اعلان نبوت کے بعد بھی، جب تقریباً

پورا مکہ آپ کے خلاف ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آزادی سے جینے تک کا حق سلب کرنے پر اتر آیا، اس وقت بھی مشرکین مکہ آپ کی صداقت اور امانت پر حرف گیری کی جرأت نہ کرسکے، اس وقت بھی پورے مکہ میں ایک شخص ایسا نہ تھا جو آپ کی اس متفقہ حیثیت کو زیر بحث لانے کی ہمت کرسکتا، بل کہ حد تو یہ ہے کہ ایک جانب آپ کو نعوذ باللہ شہید کردینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور آپ ہجرتِ مدینہ کا عزم فرمارہے ہیں، اور دوسری جانب اپنی امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے پاس رکھ رہے ہیں، یہ وہ امانتیں تھیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کی جانب ہجرت فرماتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سونپ کر گئے تھے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ امر واقعی ہے کہ ابوجہل جیسا دشمن اسلام اور دشمن رسالت مآب بھی، آمدِ اسلام کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے ہوئے یہ کہتا تھا کہ محمد!

انا لا نکذبک ولکن نکذب بما جئت به

میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ تم کہتے ہو، اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾ (١)

سو (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو نہیں جھٹلاتے، بل کہ یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ (٢)

دیکھا جائے تو یہ اس کی عقل کا پھیر ہی تھا، ورنہ جو شخص سچا ہو، اور اس کی صداقت، راست بازی ضرب المثل کا درجہ پاچکی ہو، جس کی گفتار میں سچ کے سوا کسی دوسری چیز کا دخل ہی ممکن نہ ہو، اس کی ہر بات سچی ہوگی، اس کے بارے میں کسی دوسری بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، مگر اس کے باوجود وہ آپ کے قول کو رد کرتے ہوئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کو جھوٹ کہنے کی جرأت نہ کرسکا، درحقیقت گواہی وہی ہوتی ہے، جو دشمن بھی دینے پر مجبور ہو۔

١۔ الانعام: ٣٣

٢۔ ترمذی: ج ٥، ص ٢٦، رقم ٣٠٧٥

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی راست بازی وصداقت شعاری کے بارے میں یہ واقعات بیسیوں بار ہم نے پڑھے ہوں گے، روزانہ بیان ہوتے ہیں، اور لکھے جاتے ہیں، لیکن ان سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ یہ جاننے کی شاید ہم نے کوشش نہیں کی، یا شاید جانتے بوجھتے بھی ہم لاعلم نظر آنا چاہتے ہیں، اور تجاہل عارفانہ کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیوں کہ سبق تو بہت آسان ہے، مگر اسے یاد کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔ وہ سبق یہی ہے کہ عملی زندگیوں میں ہمارے ہاں بھی صداقت شعاری امانت داری اور راست بازی اسی قوت کے ساتھ پیدا ہو جائے، جس کے بعد پھر کسی کو انگشت نمائی کی ہمت نہ ہو۔

جو حضرات کسی بھی پہلو سے خدمت دین سے وابستہ ہیں، ان کے لیے اس واقعے سے حاصل ہونے والا سبق زیادہ اہم ہے، کیوں کہ اگر راست بازی اور امانت ودیانت کا وہی معیار ہمارے سامنے ہو تو پھر نہ صرف یہ کہ کام کی رفتار بڑھ سکتی ہے، بل کہ عملی طور پر ہم دوسروں کو دعوت دینے کی پوزیشن میں کھڑے ہو سکتے ہیں، مگر جب صورت حال یہ ہو کہ الا ماشاء اللہ ہر کوئی اپنے دامن پر صرف ایک نہیں کئی ایک (غلط یا صحیح) الزامات لیے ہوئے ہو، وہاں یہ توقع کرنا کہ ہمارے قول وفعل کو عام لوگ بھی قابل عمل سمجھیں گے، یا ہماری بات میں وزن محسوس کریں گے بالکل عبث ہے۔

صداقت وامانت کا نبوی معیار آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ الفضل بما شہدت بہ الاعداء کے مصداق مخالف قوتیں اپنی پوری کوشش کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور امانت ودیانت کو متنازع نہ بنا سکیں، یہی معیار ہر دور میں اصل معیار رہا ہے، اور یہی معیار آج ہمیں مطلوب ہے، خصوصاً غیر مسلموں کے سامنے قبول اسلام ہی آج اسلام کی تعلیمات نہیں، مسلمانوں کی مروّجہ اخلاقیات اصل رکاوٹ ہیں، اور ان میں صداقت اور امانت ودیانت سرفہرست ہیں، جن کے مفاہیم اور اصل تصورات ہی غالباً ہمارے بدعملیوں کے بوجھ تلے دب کر تبدیل ہو چکے ہیں، اور یہ بات سامنے کی ہے اور ہم سب کو مان لینی چاہیے کہ ہماری اس کمزوری کے سبب جو غیر مسلم اسلام کو قبول نہیں کر رہے ہیں، ان کے اس عمل میں ہمارا بھی حصہ ہے، اور ہمیں اس بارے میں اپنے رویے پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اسوۂ حسنہ کی کامل اتباع کی توفیق نصیب

کرے، جن کا قول مبارک ہے کہ:

بعثت لأتمم حسن الاخلاق (۱)

میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

۱۔ موطا امام مالک / باب حسن الخلق

صدق اور صداقت

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر خدمت ہوا، اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ میں چار برائیاں پائی جاتی ہیں، ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں اور چوتھی برائی مجھ میں یہ ہے کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے آپ فرمائیں کہ کون سی برائی ترک کردوں؟ اب چاروں گناہ اس نوعیت کے تھے کہ کسی کے لیے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس گناہ کو جاری رکھو، لیکن نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اب ایسا پُرحکمت جواب عطا فرمایا کہ تمام برائیوں سے چھٹکارا مل گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچ کی تاثیر سے واقف تھے، اس لیے آپ نے دوسرے تمام گناہوں پر اسے ترجیح دی، چناں چہ اس شخص نے عہد کیا کہ میں اس بات پر قائم رہوں گا اور آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گا، جب رات ہوئی تو اس کے دل نے حسب عادت شراب پینے کی خواہش ظاہر کی، پھر بدکاری کا خیال آیا، مگر پھر اسے خیال گزرا کہ اگر صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھ لیا کہ رات کو شراب پی تھی یا بدکاری کی تھی؟ تو کیا جواب دوں گا؟ اگر اقرار کروں گا تو شراب پینے اور زنا کی سزا دی جائے گی، اور اگر انکار کردیا تو یہ عہد کے خلاف ہوگا اور میں جھوٹ بولوں گا، جس کو ترک کرنے کے وعدہ کر چکا ہوں، یہ سوچ کر اس رات ان دونوں گناہوں سے باز رہا، پھر رات گئے چوری کا خیال آیا تو پھر یہی فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چوری کی بابت سوال کرلیا تو کیا جواب دوں گا؟ اگر جواب اثبات میں ہوا تو چوری کی حد نافذ ہوگی اور اگر اپنے جرم سے مکر گیا تو یہ عہد کے خلاف ہوگا، نتیجتاً اس گناہ سے بھی باز رہا۔

صبح کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں

جھوٹ نہ بولنے کی وجہ سے اپنی بقیہ دیگر بدعات سے بھی چھٹکارا پا گیا، آپ ﷺ یہ سن کر خوش ہوئے۔(۱)

سچائی کو انسان کے ہر قول و فعل کے درست ہونے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور انسان کے قول و فعل کی صداقت کو پانے کا پیمانہ یہ ہے کہ اس کا دل اور اس کی زبان دونوں باہم ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور صورتاً و معناً مربوط ہوں، اسی کا نام سچائی ہے اور اسی کو صدق و صداقت کہا جاتا ہے۔ سچا آدمی ہر برائی سے محفوظ رہے گا اور جو شخص اس عظیم دولت سے محروم ہے وہ دنیا کی ہر برائی کی آماج گاہ بن سکتا ہے، جب کہ سچے آدمی کے لیے ہر نیکی کا راستہ آسان ہے اور زندگی کی ہر راہ سہل ہے۔

سچائی کی فضیلتوں میں سب سے اہم بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ دیکھنے میں ایک خوبی ہے مگر بے شمار خوبیوں کا مخزن ہے۔ راست باز اور راست گو شخص ایک طرف تو ایمان دار ہوگا، دوسری طرف وہ وعدہ وفا کرنے والا بھی ہوگا، عہد کا پاس دار ہوگا، پھر وہ شجاعت و حریت فکر و عمل کا مالک بھی ہوگا، اس کا دل صاف اور ریا کاری کی کم زوریوں سے پاک بھی ہوگا، اس کی سوچ بلند اور وہ منافقانہ روش سے محفوظ و مامون ہوگا۔ صدق و صداقت کا ہماری عملی زندگی سے بڑا گہرا اور قریبی تعلق ہے اور ہماری بہت سی عادات اور معاشرتی ضرورتیں اس کے گرد گھومتی ہیں، اسلام میں جہاں اس کی بے حد اہمیت ہے، وہیں اس کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، اس کی بڑی اور بنیادی تین قسمیں مقرر کی جا سکتی ہیں:

۱۔ زبان کی سچائی۔ ۲۔ دل کی سچائی۔ ۳۔ اور عمل کی سچائی۔

انسان کی اگر زبان پر کچھ ہو اور دل میں کچھ اور تو یہ منافقت بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ اسی طرح اگر انسان کا دل ایک امر کی گواہی دے رہا ہے، مگر اس کا عمل اس سے ہم آہنگ نہیں تب بھی وہ قول و فعل میں تضاد کے ساتھ ساتھ عمل کے جھوٹ کا مرتکب قرار پائے گا، جو کسی بھی صاحب کردار شخص کے لیے مناسب اور پسندیدہ عمل قرار نہیں دیا جا سکتا، نہ کوئی ذی حیثیت شخص ایسے کسی کردار اور رویے کا اپنی جانب انتساب پسند کرتا ہے۔

۱۔ شبلی نعمانی۔ سیرت النبی: ج۶، ص ۱۷۸

رسول اللہ ﷺ نے سچائی کی اہمیت اپنے اقوال وفرامین کے ذریعے بھی واضح کی ہے۔ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، پھر پوچھا گیا کہ کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! پھر آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔(۱)

سچائی سے متصف ہونے والے اللہ کی نظر میں بلند مراتب کے حق دار ہونے کے ساتھ دنیاوی امور میں بھی بہت سے زخموں سے بچ جاتا ہے اور اپنا اعتبار بھی قائم کرلیتا ہے، جو آج کے دور میں ایک تیزی سے ختم ہوتا، ہوا وصف ہے، اور یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ ایک بار خواہ ضرورتاً ہی جھوٹ بولا جائے تو پھر اس کو مبنی بر حقیقت ثابت کرنے کے لیے سو مزید جھوٹ علیحدہ سے بولنے پڑتے ہیں اور پھر بھی سلسلہ تھمتا نہیں بل کہ مزید دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کا انسانی معاشرہ جن صفات کو تیزی سے کھوتا جا رہا ہے، ان میں ایک یہی صفت صدق وصداقت بھی ہے۔اور کتنے ہی شعبے تو ایسے ہیں جہاں جھوٹ کو گویا ایک جائز صورت حاصل ہوگئی ہے اور اس کو اس شعبے کی ضرورت کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ یہ ایک خطرناک روش ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم اپنی عادات اور صفات کو مسلمہ اسلامی اور اخلاقی اصولوں کی روشنی میں پرکھیں، مگر ہو یہ رہا ہے کہ ہم اپنی بگڑی ہوئی اور فساد زدہ عادتوں کے دفاع کی خاطر مسلمہ اسلامی اصولوں اور طے شدہ اخلاقی قدروں تک کو چھوڑنے پر تیار ہو رہے ہیں، سچائی کا کلمہ تو ہر ایک کی زبان پر جاری ہوگا، مگر عملاً ہم سب ہی (الا ماشاء اللہ) اس میدان میں پیچھے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسا شعبہ ہے جہاں خود احتسابی وقت کا اولین تقاضا ہے، جس کا مطالبہ وہ ہم سب سے کر رہا ہے۔

یہ موضوع نہ تحریر کا ہے نہ تقریر کا۔ یہ تو عمل کا میدان ہے اور ایک نظر آنے والی چیز ہے اس کے لیے دلیل کی بھی ضرورت نہیں، نہ اس کے اثبات کے لیے ثبوت وشواہد کی حاجت ہے۔ یہ اپنا خود بیان ہے اور اپنی دلیل آپ ہے، اور یہ ایسی دولت ہے جو جہاں بھی ہے وہاں خوش بو کی مانند اپنا وجود خود منوا رہی ہے، اور اپنا فیضان بھی عام کر رہی ہے۔

۱۔ مؤطا امام مالک: کتاب الکلام، باب ماجاء فی الصدق والکذب

سچائی کی طاقت

اسلام ایک عالم گیر سچائی ہے۔ ایسی سچائی جو دیکھی بھی جا سکتی ہے، سوچی بھی جا سکتی ہے، سمجھی اور محسوس بھی کی جا سکتی ہے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بہت سے صحیفوں اور قدیم مذہبی نوشتوں میں بہت سی پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں آپ کی سچائی کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی سچائی کو بھی بیان کیا گیا ہے، یہ ایک بڑی عجیب بات ہے اور یہ پہلو بہ جائے خود اعجاز نبوت کی عظیم شکل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

ان پیشین گوئیوں میں انجیل کی ایک پیشین گوئی دل چسپ بھی ہے، اور معنی خیز بھی۔ یوحنا کا ایک مکاشفہ اس طرح بیان ہوا ہے:

اور قوموں کو مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔(۱)

یہاں اس پیشین گوئی میں واضح طور پر منہ سے نکلنے والی تیز تلوار سے مراد ایک صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور گفت گو کی تاثیر ہے، اس کے علاوہ اس روایت کا اور کوئی مفہوم نہیں ہوسکتا۔ یہ پیشین گوئی دراصل سچائی کی طاقت کی طرف اشارہ ہے، یہ اس بدیہی اور واضح حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام فطری سچائی ہے، جسے اگر اس کی اصل شکل میں پیش کر دیا جائے تو اس کی تاثیر کو مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی، وہ اپنا وجود خود منوائے گی اور سچ محض اپنی قوت سے ظاہر ہوتا چلا جائے گا۔

اسلام نے جس تیزی سے اپنے پیغام پورے عالم میں پھیلایا، وہ تاریخ کا ایسا عجوبہ ہے، جس پر عالم انسانیت آج تک حیرت میں مبتلا ہے، اور اپنی حیرتوں کو دور کرنے کے لیے اس کی

۱۔ انجیل۔ یوحنا:۱۹۔۱۵

پشت پر موجود اسباب تلاش کرنے میں لگی ہوئی ہے، ان کی تگ و دو انہیں کبھی کسی وادی میں گھسیٹی ہے، کبھی کسی وادی میں سرگرداں لیے لیے پھرتی ہے، مگر گوہر مقصود پھر بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔

ان کی تگ ودو کبھی ان سے یہ کہلواتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا، کبھی وہ مسلم حکم رانوں کو مطعون کرتے ہیں، کبھی ان کے جرائم ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں، یہ سب کچھ ہے، مگر ان کی تحقیق میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور رہ جاتی ہے، جس کا اظہار ان کے جھینپے ہوئے قلم اور شرمندہ شرمندہ سطور سے ہوتا ہے۔

چلیے تسلیم کرلیا کہ اسلام تلوار سے پھیلا مگر سوال تو یہ ہے کہ اس تلوار کو یہ قوت کس نے عطا کی کہ اس نے صدیوں سے موجود مضبوط قوتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا؟ اس تلوار کو تھامنے والے بازوؤں کو یہ طاقت کس نے بخشی کہ انھوں نے ہر ناممکن ہدف کو ممکن بنا دیا اور تمام منزلیں ان کے لیے پانی ہوگئیں؟ اگر یہ کرشمہ مسلم حکم رانوں کا تھا، اگر اسلام کے پھیلنے میں ان کا کردار ہے تو یہ حکم ران خود کیا تھے؟ ان میں یہ جذبۂ محرکہ کہاں سے آیا؟ ان کی یہ نہج کس نے عطا کی؟ ان کی سمت نمائی کہاں سے ہوئی؟ درست بات یہ ہے کہ یہ اسلوبِ تحقیق بجائے خود تحقیق کا محتاج ہے، اگر کسی سوال کا جواب مزید دس سوالات کو جنم دے تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ جواب ناقص ہے، اس کی بنیاد ہی میں خرابی ہے۔

درست بات یہ ہے کہ اسلام اپنی سچائی کی قوت سے پھیلا، یہ اس طرح پھیلا جسے بچہ اپنی فطرت کے مطابق بڑھتا اور بڑا ہوتا ہے، اس کی فطرت اس کے نشونما کا اہتمام کرتی ہے، نظر آنے والے عوامل تو محض علامت ہوتے ہیں، قوت کہیں اور ہوتی ہے۔

ہاں تلوار نے بھی اس عمل میں اپنا کردار ادا کیا، جب جنگیں مسلط کردی جائیں تو فلسفۂ مودت تبدیل ہو جاتا ہے، اور عدل کے تقاضے بدل جاتے ہیں، اور جب راہِ حق میں رکاوٹیں کھڑی کردی جائیں تب بھی آگے بڑھ کر اقدام کرنا اور اقدام کر کے اپنے تحفظ کو یقینی بنانا کسی طور قابل طعن نہیں، نہ شرعاً نہ اخلاقاً نہ قانوناً۔ یہ وہ نکتہ ہے، جس پر مداہنت یا مرعوبیت قطعاً غیر ضروری ہے۔

انجیل کی مذکورہ بالا پیشین گوئی میں اس عالم گیر حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ نبیٔ رحمت علیہ

الصلاۃ والسلام کا پیغام اس حد تک کشش اور جاذبیت رکھتا ہے کہ آپ اپنے لب مبارک سے میدان عمل میں فتوحات کے جھنڈے گاڑتے چلے جاتے ہیں۔

یہ قوت آج بھی قرآن وسنت کی شکل میں، اسوۂ حسنہ اور تعلیمات نبوی علیہ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ قوت اور اس تاثیر معلوم بھی ہے، موجود بھی ہے، اور آزمودہ بھی، اس پیغام کی قوتِ تاثیر ہماری دیکھی بھالی ہے، ہمارے بار بار کی آزمائی ہوئی ہے، مگر ہماری اس طرف توجہ نہیں ہے۔

کمی صرف ہم میں ہے، یقین فرمایئے پیاسی انسانیت آج سہارے کی تلاش میں ہے، اور وہ سہارا انسانیت کو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں مل سکتا ہے۔ جنہیں خود خالق کائنات نے تمام جہانوں کے لیے رحمت اور پوری انسانیت کا ہادی اور رہبر کامل قرار دیا ہے۔ ایسی شخصیت دوبارہ جنم ہی نہیں لے سکتی، کجا کہ کوئی ایسی شخصیت ہو جو ان کے مقابل پیش کی جاسکے، کوئی ان کے مقابل آسکے۔

شرم وحیا

شرم وحیا بجا طور پر انسانیت کا زیور اور آدمیت کا سنگھار ہے، نبیٔ رحمت علیہ الصلاۃ والسلام کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے تھے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد حیاء من العذراء فی خدرہا (۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پردہ نشین کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔

درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تلقین فرمائی ہے اس کی رو سے حیا ایمان کا حصہ ہے۔ شرم وحیا کے باب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز بالکل فطرت انسانی کے عین مطابق تھا۔ صحیح فطرت شرم وحیا کی ان ہی حدود و قیود کا تقاضا کرتی ہے، جن کی تعلیم اسلام دیتا ہے اور جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہماری راہبری کرتی ہیں۔ البتہ یہ فطرت جب حالات، معاشرے یا کسی نوعیت کے جبر کے تحت مسخ ہو جاتی ہے تو پھر انسانی نظریں ان حیا سوز مناظر سے دوچار ہوتی ہیں جن پر شاید ابلیس بھی کبھی شرما جاتا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، اوصاف اور شخصی کمالات کا مطالعہ کرتے ہوئے شرم وحیا کے معاملے میں عرب دور جاہلیت کے اس مزاج و مذاق اور ماحول و معاشرت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا جس سے عرب اس دور میں گزر رہا تھا، کہا جاسکتا ہے کہ عربوں کے ہاں اس وقت ایک قبائلی طرز کا نظام تھا لیکن اخلاقی اعتبار سے تنزل انتہائی درجوں تک ان کے ہاں آچکا تھا، شرم وحیا کا تصور بھی انحطاط کی آخری حدود کو چھو رہا تھا، وہ بعض اوقات کعبۃ اللہ تک کا

۱۔ مسلم: ج ۴، ص ۹۳۰، رقم ۲۳۲۰

طواف ننگے ہو کر کر لیتے تھے۔(۱)

پھر چوں کہ شہری اور متمدن زندگی کا آغاز نہ ہوا تھا، اس لیے حاجاتِ بشریہ کے لیے عرب جنگل ہی کا رخ کیا کرتے تھے، (۲) لیکن وہ حاجاتِ بشریہ سے فراغت کے لیے کسی آڑ یا پردے کو ضروری خیال نہیں کرتے تھے، بل کہ اس دوران وہ آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور اس دوران باہم بات چیت میں بھی مشغول رہتے تھے۔ چناں چہ بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی (۳)

یہ تمام طور طریقے ان کی معاشرت کا حصہ تھے، پھر نکاح وغیرہ کے قوانین بھی ان کے من پسند تھے۔ جن میں شرم وحیا کے اسلامی تصور کا نشان تک نہیں ملتا، ان حالات میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی، اور اس بے حیائی کے مقابلے میں شرم وحیا کا فطری قانون اہل عرب کے سامنے پیش کیا تو عربوں کے لیے اسے قبول کرنا بہت مشکل تھا، لیکن اس کے باوجود دیکھتے ہی دیکھتے ان میں ایسی انقلابی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ ان میں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ جیسے صحابیٔ رسول بھی ابھرے، جن کے بارے میں ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک موقع پر فرمایا:

الا استحی من رجل تستحی منه الملائكة (۴)

ان سے میں کیوں شرم نہ کروں، جن سے فرشتے بھی شرم کرتے ہیں۔

حیا اور شرم انسانی فطرت کا حصہ ہے اور اس کی خلقت میں شامل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے فرمایا:

ان مما ادرک الناس من کلام النبوة الاولی اذا لم تستح فاصنع

۱۔ ابن خذیمہ: ج ۴، ص ۲۰۸، رقم ۲۷۰۱

۲۔ بخاری: کتاب التفسیر، باب الذین جاء وبالافک

۳۔ ابوداؤد: ج ۱، ص ۲۰، رقم ۱۵

۴۔ مسلم: ج ۴، ص ۸۱، رقم ۲۴۰۱

ماشئت (۱)

لوگوں تک گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کی جو باتیں پہنچی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر تم حیا نہیں کرتے تو جو چاہے کرو۔ (یعنی پھر کسی برے کام میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہوگی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرم وحیا کا درس انبیا کرام کی تعلیمات اور ان کے اصلاحی نصاب کا ہمیشہ سے اہم حصہ رہا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شرم وحیا کے جس بلند معیار کو لے کر مبعوث ہوئے تھے اس کے تقاضے کچھ اور تھے، اسی معاشرے میں جس کے متعلق ذکر کیا جاچکا ہے کہ حوائج ضروریہ سے فراغت کے وقت آمنے سامنے بیٹھ کر گفت گو کرنا بھی پسندیدہ مشغلہ تصور کیا جاتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصد کے لیے شہر سے اس قدر دور نکل جاتے تھے کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور مکہ مکرمہ میں جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرماتے اس دوران آپ اس غرض سے اس قدر دور تشریف لے جاتے کہ حدودِ حرم سے بھی باہر نکل جاتے تھے، جس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے کم ازکم تین میل تھا۔ (۲)

شرم وحیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کا حصہ تھا، اس بنا پر اس کا اثر آپ کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہوتا تھا، آپ کسی سے بدزبانی نہیں کرتے تھے، بازار سے گزرتے ہوئے خاموش رہتے، اگر بھری محفل میں کوئی بات ناگوار گزرتی تو بھی زبان سے کچھ نہ فرماتے، البتہ اس کا اثر چہرۂ انور سے ظاہر ہوجاتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فوراً متنبہ ہوجاتے تھے۔ (۳)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا اور شرم کی اسی اہمیت کو اپنے ارشادات اور تعلیمات کے ذریعے بھی امت کے سامنے واضح فرمایا ہے، جن کی روشنی میں ظاہر ہوتا ہے کہ حیا کا مطلب اسلام کی نظر میں بہت وسیع ہے، اس کی رو سے شرم وحیا صرف یہی نہیں ہے کہ انسان شرم ناک

۱۔ بخاری: کتاب الادب، باب اذالم تستح فاصنع ماشئت

۲۔ نسیم الریاض۔ شرح الشفاء: ج ۲، ص ۱۱۶

۳۔ مسلم: ج ۴، ص ۹۳۹۔ رقم ۲۳۲۰، و ۲۳۲۱

اور فحش کاموں سے اجتناب کرے، بل کہ انسان کو سب سے زیادہ حیا اپنے خالق کائنات سے کرنی چاہیے، اس لیے کہ وہ سب سے بڑا اور سب کا محسن ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ حیا اپنے بڑوں اور محسنوں سے ہوتی ہے، اس حیا کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کا ہر معاملے میں خیال رکھے اور جن امور میں اس کی ناراضی کا خدشہ ہو ان کے قریب بھی نہ جائے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

لکل دین خلق و خلق الاسلام الحیاء (۱)

ہر دین کا ایک امتیازی وصف ہوتا ہے، اور دین اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حیا ایمان کا حصہ ہے، اور ایمان کا مقام جنت ہے اور بے حیائی بدکاری کا حصہ ہے اور بدکاری دوزخ میں لے جانے کا سبب ہے۔ (۲)

حیا کو انسان کے کردار کی کسوٹی بھی قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے ذریعے انسان کے ایمان اور اس کی ذاتی اور شخصی خوبیوں کو بسہولت پرکھا جاسکتا ہے، اسی لیے ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ماکان الفحش فی شیء الاشانه، وما کان الحیاء فی شیء الازانه (۳)

بے حیائی جس چیز میں بھی ہوگی اسے عیب دار بنادے گی۔ اور حیا جس چیز میں بھی ہوگی اسے مزین کردے گی۔

اور ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حیا اور ایمان دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، ان دونوں میں سے اگر ایک نہ رہے گا تو دوسرا بھی نہ رہے گا۔ (۴)

۱۔ موطا: کتاب حسن الخلق، باب ماجاء فی الحیاء

۲۔ ترمذی

۳۔ ترمذی: ج ۳، ص ۳۹۲، رقم ۱۹۸۱

۴۔ طبرانی۔ کبیر

یہی سبب ہے کہ انسان جب حیا سے محروم ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ چھوٹی برائیوں سے بڑی اور زیادہ مہلک برائیوں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک برائیوں کی دلدل میں غرق ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حیا ہی سب کچھ اور مومن کا اصل سرمایۂ حیات ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کے پاس سے گزرے وہ اپنے بھائی کو شرم وحیا سے باز رہنے کی نصیحت کر رہا تھا، آپ نے فرمایا:

دعه، فان الحياء من الايمان (۱)

اسے چھوڑ دو، کیوں کہ حیا تو ایمان کا حصہ ہے۔

دیکھا جائے تو اس کا آغاز حیا اور شرم کو ترک کرنے سے ہی ہوتا ہے، اس اعتبار سے حیا کو گناہوں سے بچانے والی بندش اور رکاوٹ بھی قرار دیا جاسکتا ہے، یہی بات دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمائی ہے، فرمایا:

> اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس سے حیا چھین لیتا ہے جب اسے سے حیا چھینی جاتی ہے تو وہ انتہائی قابلِ نفرت ہو جاتا ہے، پھر جب وہ قابل نفرت ہو جاتا ہے تو اس سے امانت چھین لی جاتی ہے، پھر جب اس سے امانت چھن جاتی ہے تو وہ خیانت کرنے لگتا ہے، پھر اس سے اللہ کی رحمت چھین لی جاتی ہے اور وہ انتہائی ملعون ہو جاتا ہے اور جب وہ لائق ملامت ہو جاتا ہے تو اسلام کا قلادہ (ہار) اس کی گردن سے نکل جاتا ہے۔ (۲)

یعنی انسان کی انسانیت اور حیوان کی حیوانیت کے مابین فرق حیا سے ہے، حیا کا پردہ اگر درمیان سے اٹھ جائے تو اس میں اور کسی چوپائے میں کچھ فرق نہیں رہتا، جیسا کہ مغربی معاشرے میں دیکھا جاسکتا ہے، اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ بلندیوں کی جانب پرواز

۱۔ ابوداود: ج ۴، ص ۲۶۹، رقم ۴۷۹۵

۲۔ ابن ماجہ

کرنے والا انسان جانوروں سے بھی پست مقام کا حق دار بن جاتا ہے۔

حیا کے بہت سے تقاضے ہیں، گفت گو میں ادب کا خیال رکھنا، معاملات میں شرم کا پاس رکھنا، دلوں کو بغض اور کینے سے محفوظ رکھنا، زبانوں کو غیبت سے بچانا اور سب سے بڑھ کر اپنے رب سے شرم کرتے ہوئے اپنے مختصر سے وجود کو گناہوں اور خالق و مالک کی نافرمانیوں سے آلودہ نہ ہونے دینا، یہ تقاضے اگر ہم پورے کر رہے ہیں اور شرم وحیا کے عرفی واصطلاحی مفہوم اور تقاضوں پر بھی ہم پورا اترتے ہیں تب تو ہمیں نبیٔ رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے امتی کہلانے کا حق ہے، ورنہ اس آئینے میں اپنے گزرے ہوئے ایام اور شب و روز کی تصویر اور اپنے اعمال کا عکس دیکھنا ہمارے لیے اپنے اندر بڑی ہی عبرت کا درس رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ پردہ پوشی فرمائے اور شرم وحیا کے زیور سے ہم سب کو آراستہ فرمائے۔ آمین۔

شجاعت

غزوۂ حنین کئی ایک اعتبار سے مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش ثابت ہوا، ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مسلمانوں کی کثیر فوج بنو ہوازن کے تیر اندازوں کی جانب سے تواتر سے پھینکے جانے والے تیروں کی بارش کے سبب تتر بتر ہوگئی، لیکن اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند جاں نثار صحابہ کے ساتھ بدستور میدان کارزار میں ڈٹے رہے، اور اپنے خچر کو ایڑ لگا کر برابر دشمن پر حملہ آور ہوتے رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے ثابت میں ذرا برابر لغزش نہیں آئی، حضرت برا رضی اللہ عنہ بھی اس معرکے میں شریک تھے، ان سے کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ بھی اس معرکے میں بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر ثابت قدم رہے، وہ کہتے ہیں:

اشهد علی نبی الله صلی الله علیه وسلم انه ما ولی (۱)

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹھ نہیں پھیری۔

اور دوسری روایت میں حضرت برا رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ جب لڑائی شدید ہوتی تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی پہلو میں پناہ لیتے تھے، اور ہم میں سب سے بہادر اس شخص کو سمجھا جاتا تھا جو میدان کارگزار میں آپ کے پہلو میں کھڑے ہو کر داد شجاعت دے رہا ہوتا تھا۔ (۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں

۱۔ ابن ابی شیبہ: ج ۷، ص ۴۱۶، رقم ۳۶۹۸۳

۲۔ شامی: ج ۷، ص ۴۷

فرماتے ہیں:

ما رأیت احدا انجد ولا اجود ولا اشجع ولا اضوأ واوضأ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱)

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو نہ مضبوط دیکھا، نہ بہادر، نہ روشن۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت بھی پورے عرب میں تسلیم شدہ تھی، اور مشرکین عرب بھی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کے سامنے ٹھہرنا کسی کے بس کی بات نہیں، ابیّ ابن خلف مشہور سردار ہے، مشرکین مکہ میں اسلام دشمنی کے حوالے سے اس کا نام نمایاں ترین افراد کی فہرست کا حصہ ہے، اس کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے موقع پر گرفتار ہوا تھا اور فدیہ دے کر رہا ہوا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ میں اپنے گھوڑے کو روزانہ ایک فرق (آٹھ سیر وزن کا ایک پیمانہ) دانہ کھلاتا ہوں اور اس پر سوار ہو کر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نعوذ باللہ) قتل کروں گا، اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بل کہ میں تمہیں قتل کروں گا، ان شاء اللہ۔

چناں چہ احد سے واپسی پر ابیّ بن خلف گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے سامنے آیا اور کہنے لگا کہ اگر اب تم بچ نکلے تو مجھے خدا نہ بچائے، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے کوئی اسے قتل نہ کر دے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو جب وہ قریب آ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث بن محمدؓ سے نیزہ لے کر اس کی گردن میں ایک چوکا دیا، ابیّ اپنے گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور بیل کی طرح دھاڑنے لگا اور کہنے لگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے مار دیا، لوگوں نے کہا کہ یہ تو معمولی خراش ہے اس نے کہا:

یہ زخم اگر ربیعہ اور مضر کے تمام لوگوں کو لگتا تو انہیں بھی ہلاک کر دیتا، کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا؟ اگر وہ مجھ پر تھوک بھی دیتے تب بھی میں ہلاک ہو جاتا۔

ا۔ دارمی: ج ا، ص ۴۴، رقم ۵۹

پھر وہ اسی طرح بلبلاتا رہا اور مقامِ سرف کے قریب پہنچ کر ہلاک ہو گیا۔(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں ایک ریاست کے امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، پھر جس قدر جاں نثار صحابہ کرامؓ کا ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا وہ بھی تاریخ عالم کا ایک منفرد واقعہ ہے، جس کی نظیر تک کسی اور شخصیت کے رفقا میں نہیں مل سکتی، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات آپ اپنے صحابہ کو زحمت ہی نہ دیتے تھے اور خود خطرات کا سامنے کرنے میں پہل فرماتے تھے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک دفعہ مدینے میں شور ہوا کہ دشمن آ گیا، لوگ مقابلے کے لیے تیار ہو گئے، مگر سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نکل کر آگے آگے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے، بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے اور خطرے والے تمام مقامات کا گشت لگا کر واپس آئے اور لوگوں کو تسلی دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ بھی قول ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ولقد رأيتني يوم بدر ونحن نلوذ بالنبي صلى الله عليه وسلم وهو اقربنا الى العدو، وكان من اشد الناس يومئذ بأسا، و قيل كان الشجاع هو الذي يقرب منه صلى الله عليه وسلم، اذا دنا العدو لقربه منه (۳)
>
> ہم جنگ بدر کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آڑ میں پناہ لیتے تھے، اور ہم میں سب سے بہادر شخص اسے سمجھا جاتا تھا جو میدان جنگ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک رہتا، چوں کہ آپ دشمن کے قریب ہوتے تھے، اس لیے اس شخص کو بھی

۱۔ ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۶۶۔ الشفاء: ج ۱، ص ۶۸

۲۔ بخاری: کتاب الجہاد، باب ۲۴۔ مسلم: ج ۴، ص ۳۳، رقم ۲۳۰۷

۳۔ الشفاء: ج ۱، ص ۶۷

دشمن کے قریب رہنا پڑتا تھا۔

قدیم فلاسفہ کا کہنا تھا کہ شجاعت انسان کی قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا نام ہے، اور عصر حاضر کے اہل دانش بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ ضرورت و حاجت کے وقت مصائب و خطرات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنا شجاعت کہلاتا ہے۔(۱)

درحقیقت شجاعت مختصر لفظوں میں ضبط نفس کا نام ہے، ایسا شخص جو مصائب و آلام میں بالکل نہ گھبرائے، مشکلات، مخالفین اور حالات کی ناسازگاری اس کے عزم کو متزلزل نہ کرے، اور موقع و محل کی مناسبت سے وہ مسلسل اپنی کاوشیں درست نہج پر جاری رکھے تو ایسا بے خوف شخص شجاع اور بہادر ہے، بہادر شخص کسی سے نہیں ڈرتا، لیکن وہ صرف بے خوف نہیں ہوتا وہ معاملات کی پرکھ بھی کرتا ہے اور حالات پر گہری نگاہ بھی رکھتا ہے، وہ ہوائی اور فضائی اقدامات پر زندگی بسر نہیں کرتا، اس کا عمل زمینی حقائق کے مطابق ہوتا ہے، اسی بنا پر اسلام نے بہادری کا تعلق صرف انسانی کردار سے استوار نہیں کیا، بل کہ اسے انسانی عقیدے کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اور قرآن نے یہ درس دیا کہ شجاعت و بہادروں کا اصل مقصد اللہ کی رضا ہے کہ فتح و شکست اسی کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ (۲)

اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، بلاشبہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

بزدلی ایک طبعی عارضہ ہے لیکن اس کا سب سے بڑا سبب موت کا خوف ہے، یہی خوف بزدلی کو راہ دکھاتا ہے، اسی بنا پر اگر موت کا خوف دور ہو جائے تو شجاعت خود بہ خود تقویت پا جاتی ہے، اسلام نے اسی کی تلقین کی ہے، قرآن حکیم میں فرمایا:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ (۳)

اور اللہ کے حکم کے بغیر کسی شخص کو موت نہیں آسکتی (ہر ایک کی موت کا) مقررہ

۱۔ سیوہاروی۔ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق: ص ۳۴۳

۲۔ الانفال: ۱۰

۳۔ آل عمران: ۱۴۵

وقت لکھا ہوا ہے۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (۱)

نہ کسی کو عمر دی جاتی ہے اور نہ کسی کی کم کی جاتی ہے مگر سب کتاب میں (لکھی ہوئی) موجود ہے۔

اور پھر یہ بھی فرما دیا:

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲)

آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو اپنے اوپر سے موت کو ٹال کر تو دکھاؤ۔

شجاعت کا وہ مرتبہ ہے کہ نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے اس کی ترویج و اشاعت اور اپنی تعلیمات کے ذریعے اس کی تلقین فرمائی ہے بل کہ اس کے مقابلے میں بزدلی سے بچنے کی بھی تاکید فرمائی اور اس کی دعا بھی تعلیم فرمائی ہے، ایک روایت کے مطابق تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد اس سے بچنے کی دعا مانگا کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک دعا یوں بھی منقول ہے:

اللھم انی اعوذ بک من الھرم والجبن و البخل و عذاب القبر و فتنة الدجال

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں بڑھاپے، بزدلی، بخل، عذاب قبر اور فتنۂ دجال سے۔

۱۔ الفاطر:۱۱

۲۔ آل عمران:۱۶۸

سادگی

ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے گھر میں آرائش کی غرض سے پردے لٹکا لیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو پردے دیکھ کر گھر میں داخل ہوئے بغیر باہر ہی سے واپس لوٹ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے، جب وہ گھر آئے تو انہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس واقعے سے آگاہ کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور گھر میں داخل نہ ہونے کی وجہ دریافت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وما انا والدنیا وما انا والرقم؟

مجھے دنیا سے کیا تعلق؟ مجھے دنیاوی نقش ونگار (اور زیب وزینت) سے کیا علاقہ؟

پھر جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس پردے کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ پردے فلاں کو دے دو۔(۱)

درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم آپ کی طبعی سادگی اور تکلف سے یکسر آزاد اندازِ زیست کے سبب سے تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر معاملے میں تکلفات سے دور رہتے اور سادگی کو پسند کرتے تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ ہمیں اس باب میں ان گنت اہم اور ہماری موجودہ روش سے بالکل متضاد مظاہرِ حیات سے متعارف کرواتا ہے۔

امام ادب جاحظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے اسی پہلو کو بیان کرتے ہوئے

۱۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۴۲، رقم ۴۱۴۹

کہتا ہے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے اور زمین پر ہی نشست رکھتے تھے، عبا پہنتے اور مساکین کے ساتھ مجالست رکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں (اپنی ضرورتوں کے لیے) چل پھر لیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا لیتے اور (کھانے سے فراغت کے بعد) اپنی انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ''میں تو محض ایک بندہ ہوں، اور بندوں کی طرح ہی کھاتا ہوں، اور بندوں کی طرح ہی پیتا ہوں، اگر مجھے ایک معمولی دستی کی دعوت دی جائے گی تو میں اسے بھی قبول کروں گا اور اگر بکری کے معمولی پائے بھی مجھے ہدیہ کیے جائیں گے تو میں انہیں بھی قبول کرلوں گا'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا کبھی کھانا تناول نہیں فرمایا، اور نہ کبھی اپنے کسی غلام کو مارا، اور نہ کبھی کسی اور کو مارا، اللہ کے راستے (جہاد) کے سوا۔(۱)

جاحظ کا یہ قدرے تفصیلی بیان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ایک خاص پہلو کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، جس کا تعلق عملی زندگی سے ہے، اور معاشرے کی اجتماعیت کے حوالے سے بھی یہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، وہ ہے سادگی اور بے تکلفی۔ یہ چیز اگر مزاج کا حصہ بن جائے تو تکلفات کے پیچ در پیچ الجھاؤ کا شکار اور اس کے نتیجے میں بے شمار مصائب و مشکلات میں گرفتار ہم لوگ ان مشکلات سے آسانی کے ساتھ چھٹکارا پا سکتے ہیں، آخر اس معاملے میں بھی تو دوسرے مسائل حیات کی طرح ہادیٔ برحق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے مشعل راہ اور بہترین نمونۂ حیات ہے۔

یہ سادگی اور بے تکلفی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور حیاتِ طیبہ کے ہر پہلو پر حاوی نظر آتی ہے، مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بسترِ مبارک دیکھیے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

۱۔ جاحظ: البیان والتبیین: ج ۲، ص ۲۱

کان وسادۃ رسول اللہ ﷺ التی یتکی علیھا، من ادم حشوھا لیف (۱)

جس بستر مبارک پر آپ ﷺ سوتے تھے چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

ایک بار ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے آرام کی غرض سے آپ ﷺ کے بستر کو چوہرا کر کے بچھا دیا، رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر سوئے، صبح اٹھے تو پوچھا کہ رات کو میرے نیچے کیا بچھا دیا تھا؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ بستر (ٹاٹ) تو وہی تھا، محض آرام کی غرض سے اسے چوہرا کر دیا تھا، فرمایا:

ردوہ لحالتہ الاولی فانہ منعتنی وطاءتہ صلاتی اللیلۃ (۲)

اسے پہلی حالت پر ہی رہنے دو، کیوں کہ یہ نرم بستر آج مجھے تہجد سے مانع ہوا۔

غور کا مقام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گنجائش رکھنے کے باوجود اور ہر طرح کی سہولتیں حاصل کرنے کے بعد بھی اپنے لیے کس قسم کی زندگی پسند کر رہے ہیں؟ اور ہم محض اجازت کی آڑ لے کر اپنے آپ کو کن کن غیر ضروری سہولتوں، آسائشوں اور تکلفات کا خوگر بنا رہے ہیں؟

پھر ان مروجہ تکلفات میں بھی کئی اقسام ہیں، بعض تو قدرے بے ضرر سی یا کم از کم نقصان کی حامل ہیں، جب کہ بعض کے مضرات تو متعدی نوعیت کے ہیں، جن سے پورا معاشرہ بہ یک وقت متاثر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آج ہمارے ہاں ایک عام رجحان بھیڑ چال کا ہے، جو چیز رواج بن جائے اور فیشن میں آجائے اس کا کرنا نہ صرف شرف اور فخر کی بات ہے بل کہ اس کا نہ کرنا ہتک اور معاشرے میں حیثیت کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ اس بات کے نقصانات ہمیں صاف نظر آ رہے ہیں، صرف ملبوسات کو ہی لیجیے، طرح طرح کے فیشن آئے دن رواج پاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتے ہیں، اب سابقہ ملبوسات یک سر پرانے اور آوٹ آف فیشن قرار پاتے ہیں اور وہ قیمتی ملبوسات اور ان پر لگی ہوئی رقم سب برباد ہو جاتی ہیں۔

۱۔ مسلم: ج ۳، ص ۳۶۹، رقم ۲۰۸۲

۲۔ شمائل ترمذی: رقم ۳۲۸

ایک تو محض فیشن نبھانے کی خاطر ہر کہ و مہ کا قیمتی سے قیمتی لباس خریدنا خواہ گنجائش ہو یا نہ ہو، خواہ جیب اس کی اجازت دیتی ہو یا اس کے لیے قرض لینا پڑے، یہ بات بہ جائے خود غلط اور سراسر اصراف ہے، پھر اس لباس کو فقط اس بنا پر ایک آدھ بار جسم پر ڈال کر ترک کر دینا کہ اس کا فیشن ختم ہو چکا ہے، یا یہ لوگوں کی نظر میں آچکا ہے، اس سے بھی بڑھ کر اصراف اور فضول خرچی ہے، جس کی اسلام جیسا سادگی پسند اور تکلفات سے آزاد مذہب ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے سے اچھا اور اپنے وقت کا بہترین لباس بھی زیب تن فرمایا ہے، لیکن اپنے زندگی کو ان چیزوں کا اسیر نہیں بنایا، نہ ان کو اپنی زندگی کا ناگزیر حصہ قرار دیا، آپ ہر طرح کا موٹا جھوٹا پہن لیتے اور روکھا سوکھا کھا لیتے تھے، اسی میں آپ کی بڑائی تھی، اور اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غریب پروری اور بے تکلفانہ زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس عام طور پر سادہ ہی ہوتا تھا، اور آپ اس بارے میں بھی تکلفات کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی بنا پر جن دو کپڑوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق ایک دبیز چادر اور ایک موٹے کپڑے کا تہبند تھا۔ (۱)

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا لباس بھی سادگی اور نظافت کا نمونہ ہوتا تھا، اگرچہ بعض اوقات آپ نے قیمتی لباس بھی استعمال کیا ہے لیکن عام طور پر آپ سادہ لباس ہی پسند فرماتے تھے، ایک بار کسی نے تحفے میں خوب صورت قبا بھیجی آپ ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا:

انما یلبس ہذہ من لا خلاق لہ فی الآخرۃ

یہ لباس تو وہ پہنے جس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہو۔

پھر آپ ﷺ نے اسے پہننے کی بہ جائے حضرت عمرؓ کو دے دیا، حضرت عمر نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور دے رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میں نے

۱۔ بخاری: ج ۴، ص ۲۱

اس لیے دی ہے کہ اسے کام میں لاؤ، پہننے کے لیے نہیں دی، چناں چہ حضرت عمر نے وہ کسی کو دے دی۔(۱)

اگر چہ طرح طرح کے تکلفات میں جکڑی ہوئی آج کی ہماری معاشرت کو سادگی کا درس کچھ عجیب سا اور حالات کے تقاضوں کے خلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن اس مصنوعی زندگی نے ہمیں جن مشکلات سے دو چار کر دیا ہے، غربت کا عفریت جس طرح ہمارے ٹیلنٹ اور صلاحیتوں کو نگل رہا ہے، اور کروڑہا افراد ہماری اس دنیا میں ہماری آنکھوں کے سامنے فاقہ کشی سے دو چار ہیں، ایسی صورت حال میں تعیشات کے یہ مظاہر اور تکلفات کے یہ مناظر ہمیں آخر کس طرح زیب دیتے ہیں؟ آخر وہ پروردگار جو پڑوس میں رہنے والے شخص کی فاقہ کشی پر باز پرس کرے گا، اس اجتماعی فاقہ کشی، ہماری نگاہوں کے سامنے بسنے والی پوری پوری بستیوں کی کسمپرسی، غربت اور انتہائی غربت پر ہم سے کچھ باز پرس نہیں کرے گا؟ ہمیں یوں ہی بغیر سوال و جواب کے چھوڑ دیا جائے گا؟

۱۔ مسلم: ج ۳، ص ۶۰ ۳، رقم ۲۰۶۸

رہن سہن

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، آپ جہاں اور جس صورت میں قیام فرماتے تھے، وہاں کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ جسمِ مبارک پر صرف ایک تہبند تھا۔ ایک کھری چار پائی تھی۔ سرہانے ایک تکیہ پڑا تھا، جس میں خرمے کی چھال بھری ہوئی تھی۔ ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، ایک کونے میں پائے کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی تھی، کچھ مشکیزے کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی تھیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر قیام فرما تھا، جس کا اثر آپ کے جسمِ مبارک پر نظر آ رہا تھا، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے روتے دیکھ کر میرے رونے کا سبب دریافت فرمایا! میں نے عرض کیا:

یا رسول اللہ ان کسریٰ و قیصر فیما ھما فیہ، وانت رسول اللہ؟

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں کیوں نہ روؤں، قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہو کر، آپ کے سامانِ خانہ کی یہ کیفیت ہو۔

ارشاد ہوا:

اما ترضی ان تکون لھما الدنیاء لک الآخرۃ؟ (۱)

(اے ابنِ خطاب)! تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ یہ دنیا لیں اور ہم آخرت۔

۱۔ مسلم: ج ۲، ص ۱۰۹۵، رقم ۱۴۷۹

ملاحظہ کیجیے، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رہن سہن۔ سادگی کی کیفیت اور ایک جاں نثار صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گزارش پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبصرہ۔ یاد رہے کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے، جب اسلامی ریاست جڑ پکڑ چکی تھی اور استحکام کی راہ پر گام زن تھی، فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا اور مالی وسائل اس قدر ضرور تھے کہ بہ حیثیت حاکم و امیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضروریاتِ زندگی سے بہ سہولت فائدہ اٹھا سکتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کو ترجیح دی، اور دنیا سے قدرِ ضرورت بھی فائدہ اٹھانا پسند نہیں فرمایا۔

اس واقعے کی روشنی میں ہم اپنی تصویر بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں، اور دیکھ سکتے ہیں کہ حبِّ نبی اور عشقِ رسول کے ہمارے دعوے کس قدر صداقت سے لب ریز اور سچائی سے پُر ہیں۔

ہمیں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کی بنیاد قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ملتی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ (۱)

اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان چیزوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیے جو ہم نے مختلف گروہوں کو استعمال کے لیے دے رکھی ہیں، تاکہ اس میں ہم اُن کی آزمائش کریں۔ (کیوں کہ) وہ (محض) دنیاوی زندگی کی رونق ہے، اور آپ کے رب کا دیا ہوا رزق ہی بہتر اور بہت باقی رہنے والا ہے۔

انسان کی دنیاوی زندگی بہت سے علائق کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے اپنے تقاضے ہیں، ضرورتیں ہیں، کچھ خواہشات ہیں، پھر ان کے اپنے مختلف درجات ہیں، جن کے مابین ایک مسابقت کی کیفیت رہتی ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کی زندگی کا حصہ ہیں، مگر یہ انسان کا مقصود نہیں، ضرورت، ضرورت کے ہی درجے میں رہے تو کبھی بھی وہ انسان کے لیے فتنہ نہیں بن سکتی۔ دولت کی آزمائش یہی ہے کہ اس کی طلب بڑھتے بڑھتے بال آخر ہر دوسری چیز پر حاوی ہو جاتی ہے، اور وہ ضرورت سے بڑھ کر مقصود بن جاتی ہے۔ پھر انسان کی تگ و دو کا واحد ہدف

۱۔ طٰہٰ: ۱۳۰

فقط دولت کمانا رہ جاتا ہے۔ یہی وہ صورت ہے جب انسان آخرت سے، فکرِ آخرت سے اور عمل بہ رائے آخرت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی مرحلے سے ہمیں منع کیا جاتا ہے، اور یہی راستہ دنیاداروں کا راستہ ہے، جس کی مذمت کی جاتی ہے۔

انسان طبعاً آسائش پسند ہے، اور نمائش کا رسیا۔ اسلام اس جذبے کی تہذیب کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ضرورت پوری کی جائے، آسائش سے بھی اعراض ضروری نہیں، مگر ایک تو آسائش مقصود نہ بنے، دوسرے یہ جذبہ نمائش تک نہ پہنچنے پائے۔ ضرورت اگر ایک سواری سے پوری ہوسکتی ہے تو گنجائش کے باوجود دوسری سواری غیر ضروری ہے، اور اسراف اور امارت پسندی میں شامل ہے، اس لیے ممنوع ہے۔ اسی طرح اگر ایک نسبتاً کم درجے کی سواری ہماری ضرورتوں کے لیے کافی ہے تو اعلیٰ درجے کی سواری کی خواہش میں نمائش کی حدود میں داخل ہوسکتی ہے۔ بعینہ یہی معاملہ انسانی ضرورتوں کی دیگر تمام اشیا کا ہے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ آپ نے بعض مواقع پر اچھا کھایا بھی ہے، اچھا پہنا بھی ہے، اچھی سواری بھی رکھی ہے، غرض دنیا کی اس وقت کی دست یاب چیزوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ چناں چہ روایات بتاتی ہیں کہ آپ کو دست کا بھُنا ہوا گوشت نہایت مرغوب تھا، جب بھی ملتا خوب شوق سے تناول فرماتے۔ خوش بو بھی پسند تھی، اسے بھی استعمال فرماتے، اچھے کپڑے اور قیمتی جبّے بھی استعمال فرمائے ہیں۔

مگر یہ سب چیزیں ضرورت تک محدود تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ کبھی ان چیزوں کی خواہش کی، نہ انہیں مجبوری بنایا۔ مل گیا تو ٹھیک ہے، نہیں ملا تو بھی کوئی بات نہیں، ان چیزوں سے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقاصد کبھی متاثر نہیں ہوئے۔

اسلام کی تاکید تو یہ ہے کہ ہر حال میں دل خوفِ خدا سے خالی نہیں ہونا چاہیے، مل گیا تو شکر کرو، کہ یہ نعمتوں میں زیادتی کا سبب ہے، اور نہیں ملا تو صبر کرو کہ اس کا ثمرہ بھی شیریں ہے۔ ہر حال میں مالک و رازق کی یاد دلوں میں تازہ اور ذہنوں میں روشن رہنی چاہیے، عبدیت کا یہی تقاضا ہے۔

رہا اُن کا احوال جو ہم سے اچھے ہیں، ہر حال میں دنیاوی اعتبار سے ہم سے بہتر نظر آتے ہیں، تو اُن (کفار) کا معاملہ تم سے مختلف ہے، اُن کا طرزِ زیست تمہارے لیے معیار نہیں بن

سکتا۔ اُن کی خوش حالی تو اسی دنیا تک محدود ہے، تم تو آخرت کے امیدوار ہو۔ اُن کی آسائشیں تو محدود ہیں، تم تو لامحدود زندگی کے خواہاں ہو۔ انہیں تو جو کچھ بھی ملنا ہے، اسی فانی دنیا میں ملنا ہے، تمہیں تو لافانی سہولتیں درکار ہیں۔ ایسے میں وہ اور تم کیسے برابر ہو سکتے ہو؟

ہاں دنیاوی ضرورتیں، یہ لمبا چوڑا بینک بیلنس، یہ بیش بہا قالین اور فرنیچر، یہ قیمتی گاڑیاں، یہ عالی شان بنگلے، یہ سب تمہارے لیے بھی حرام نہیں، بہ شرطے کہ جائز طریقوں سے حاصل کیے گئے ہوں۔ اور بہ شرطے کہ تم ان کے تقاضے بھی پورے کر سکو۔ ان سے متمتع ہونا تمہارے لیے بھی جائز ہے۔ اگر یہ سب نعمتیں میسر آ جائیں تو شکر کرو، مگر یہ تمہاری منزل نہیں ہونی چاہییں۔ یہ تمہارا مقصود نہیں بنی چاہییں۔ ان سے استفادہ کرو اور آگے بڑھ جاؤ، اور اگر دنیا کے یہ عارضی پردے تم سے تمہاری اصل زندگی اوجھل کر دینے کا سبب بن جائیں تو یہی سب پھرنا جائز ہے۔

اوپر بیان شدہ آیت کا یہی خلاصہ ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ مبارک کا یہی پیغام ہے۔

خیر خواہی

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا:

الدین النصیحة

دین تو خیر خواہی کا نام ہے۔

صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کس کی خیر خواہی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

للہ ولکتبہ ولرسولہ ولائمة المسلمین وعامتہم (۱)

اللہ کی، اس کی کتب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے حاکموں کی اور عام مسلمانوں کی۔

ہمدردی اور خیر خواہی کی صفات اسلام کے مسلمہ اخلاقی تعلیمات میں سے ہیں، اس کا خلاصہ مختصر ترین الفاظ میں وہی ہے، جو نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے الدین النصیحة کے ذریعے بیان فرمایا کہ پورا دین اسلام ہی خیر خواہی کا نام ہے، اپنی خیر خواہی، اپنے متعلقین کی خیر خواہی، اپنے حکم رانوں اور ماتحتوں کی خیر خواہی، پھر دین اسلام کی، اس کے شعائر وعلامات اور متعلقات کی خیر خواہی اور پھر عامۃ الناس کی، اللہ کی ساری مخلوق کی خیر خواہی۔ اسلامی تعلیمات کا یہی تو خلاصہ ہے، ان ہی پر عمل پیرا ہونے کی اسلام تلقین کرتا ہے، اور ہماری دنیاوی واخروی ہر طرح کی فلاح وکام یابی بھی ان ہی پر عمل پیرا ہونے میں منحصر ہے۔

اسی مفہوم کی دوسری روایت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا:

۱۔ مسلم: ایمان، بیان ان الدین النصیحة، رقم ۵۵

الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ(۱)

تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

اس روایت میں بھی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے مخلوق کی خیر خواہی، ان سے ہم دردی اور ان سے حسن سلوک کی تلقین کی ہے، یہ خیر خواہی اسلامی اخلاقیات کی اساس اور مہذب معاشرت کی جان ہے۔

خیر خواہی کی ایک طویل فہرست ہے، جس میں سب سے پہلے جو ذات آتی ہے وہ خود انسان کی اپنی ذات ہے، انسان فطرتاً جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے وہ اس کا اپنا وجود ہے، وہ اس کی بھلائی کو سب پر مقدم رکھتا ہے اور اسی کے فائدے سے اپنی زندگی کے ہر پہلو کا آغاز کرتا ہے، اس لیے خیر خواہی کا آغاز بھی اسی سے ہونا چاہیے۔ اسلام اس فطری وصف کی رعایت رکھتے ہوئے یہی تلقین کرتا ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنے آپ سے خیر خواہی کرے، پھر اس کا دائرہ بڑھاتے ہوئے اپنے جیسے دوسرے انسانوں تک لے جائے، اس بنا پر نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تلقین فرمائی کہ ہر انسان پر اس کی نفس کا حق مقدم ہے، جس کی ادائیگی اس کے ذمے لازم ہے۔

چناں چہ روایت میں آتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ سے فرمایا

فان لجسدک علیک حقا، وان لعینک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا(۲)

تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس کے حقوق کے بعض

۱۔ شعب الایمان: ج۶، ص۴۳، رقم ۷۴۴۸

۲۔ بخاری: کتاب الصیام، باب حق الجسم فی الصوم

پہلوؤں کی وضاحت فرمائی، چناں چہ عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے کہ ایک شخص پراگندہ سر اور بکھری ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ داخل ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کیا، گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو اپنے بال اور ڈاڑھی درست کرنے کا حکم دے رہے تھے، چناں چہ وہ لوٹ گیا اور پھر اپنی حالت درست کر کے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الیس ھذ خیر من ان یاتی احدکم وھو ثائر الراس کانہ شیطان (۱)

کیا یہ بہتر نہیں ہے اس سے کہ کوئی شخص تم میں سے اس حالت میں آئے کہ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہوں گویا کہ وہ شیطان (کوئی بھوت وغیرہ) ہے۔

پھر ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دے کر اسے ہر طرح کی خیر خواہی کا حق دار بنادیا۔ ایک روایت میں فرمایا

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا

ایک مومن، دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ہر حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط بناتا ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے بتایا کہ یوں۔ (۲)

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المومن مرآۃ المومن، والمومن اخو المومن یکف علیہ ضیعتہ ویحوطہ من ورائہ (۳)

۱۔ مشکوٰۃ: کتاب اللباس، باب الترجل، فصل ثالث

۲۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۰، رقم ۲۵۸۵۔ حمیدی: ج ۲، ص ۳۴۰، رقم ۷۷۲

۳۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۳۰۴، رقم ۴۹۱۸۔ ترمذی: ج ۳، ص ۳۷۳، رقم ۱۹۳۶

مومن، مومن کا آئینہ ہے اور مومن، مومن کا بھائی ہے۔ وہ نقصان دہ چیز سے بچاتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔

خیر خواہی کے اس طویل سلسلے میں حکم رانوں کا حصہ نہایت اہم ہے، اس لیے کہ انتظامی اعتبار سے ان کی ذمے داری بہت بڑی ہے، اس بنا پر ہادی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں رعایا کی خیر خواہی کی بڑی تاکید فرمائی، چناں چہ ایک روایت میں ارشاد فرمایا کہ جو امیر مسلمانوں کے معاملات کا ذمے دار ہوتے ہوئے بھی ان کے لیے مشقت نہیں جھیلتا اور نہ ان کی خیر خواہی کرتا ہے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گا۔(۱)

اتنی بڑی وعید بیان فرمانے کے بعد دوسری روایت میں فرمایا:

ان احب الناس الی اللہ یوم القیامة، وادناہم منه مجلساً امام عادل، وابغض الناس الی اللہ، وابعدہم منه مجلسا امام جائر (۲)

عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرنے والے حاکم، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو دوسرے سب لوگوں سے زیادہ پیارے اور محبوب ہوں گے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوگا اور (اس کے برعکس) قیامت کے دن وہ اربابِ حکومت اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مغبوض اور سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے جو ظلم اور بے انصافی کے ساتھ حکومت کریں گے۔

پھر رعایا کو بھی حکم رانوں کی خیر خواہی کی تلقین فرمائی اور ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح لازم قرار دیا، اور فرمایا کہ جب تک حاکم غلط کام کا حکم نہ دے رعایا کے لیے اس کے احکامات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ فرمایا:

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ، ومن یطع الأمیر فقد أطاعنی، ومن یعص الأمیر فقد عصانی، وانما الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به، فان أمر بتقوی اللہ وعدل فان له

۱۔ بخاری: کتاب الاحکام، باب من استرعی رعیة فلم ینصح

۲۔ ترمذی: ج ۳، ص ۶۳، رقم ۱۳۳۴

بذلک اجرا، وان قال بغیرہ فان علیہ منہ (۱)

جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ امام کی مثال ڈھال جیسی ہے کہ اس کے پیچھے رہ کر جنگ کی جاتی ہے اور اسی کے ذریعے (دشمن کے حملے سے) بچا جاتا ہے۔ پس اگر امام تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کا حکم دے اور انصاف کو شعار بنائے تو اسے اس کا اجر ملے گا۔ لیکن اگر اس کے خلاف کہے گا تو اس کا گناہ اس پر ہوگا۔

ان روایات سے خیرخواہی کا اسلامی تصور بہ خوبی واضح ہوجاتا ہے، درحقیقت ہر ایک کی خیرخواہی اسلامی معاشرت کی جان اور اس کی خاص پہچان ہے، کاش کہ اس کی روح ہم سب میں پیدا ہوسکے۔

۱۔ بخاری: ج ۲، ص ۱۱۰

خوش گمانی

ہجرت مدینہ کے ساتویں سال رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غالب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بنوعوال اور بنو عبد ثعلبہ کی جانب ایک سریہ روانہ فرمایا، اس سریے میں لڑائی کے دوران ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ایک شخص کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے تو اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور وہ کہہ اٹھا کہ "لا الہ الا اللہ" مگر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے یہ سوچ کر اسے قتل کر دیا کہ وہ صرف اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ رہا ہے، اس واقعے کی اطلاع اس سفر سے واپسی پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوئی، تو آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا:

الا شققت قلبه، فتعلم صادق هو ام كاذب؟ (۱)

تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا تا کہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنے اس قول میں سچا ہے یا جھوٹا؟

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آیا، انہوں نے بھی حالت جنگ میں کلمہ گو ہونے کا دعوی کرنے والے چند مسلمانوں کو غلط فہمی کی بنا پر قتل کرنے کا حکم دیا، رسول خدا نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس امر کی اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا:

اللهم انی ابرأ اليك مما صنع خالد (۲)

اے اللہ! میں تیرے سامنے خالد کے فعل سے مکمل برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

۱۔ ابن سعد۔ الطبقات: ج ۲، ص ۹۱

۲۔ ایضاً: ج ۲، ص ۱۱۲

درحقیقت ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہم صرف ظاہری حالت کو قبول کرنے کے مکلف ہیں، کسی کے دل کی کیا کیفیات ہیں؟ اس کے قول اور ایمان میں کس قدر تضاد ہے یہ اس کا اور اس کے رب کا معاملہ ہے، ہمیں حکم یہی ہے کہ ہر معاملے میں خوش گمانی کا مظاہرہ کریں، ہر معاملے میں خوش فہمی کا اظہار کریں، مثبت پہلو سامنے رکھیں، روشن رخ کو دیکھیں اور اچھے پہلوؤں کو پھیلائیں، اور جہاں کہیں کوئی برا پہلو نظر آئے، کسی بات کے بارے میں یقین بھی ہو جائے کہ وہ غلط ہے، تب بھی اسے پھیلانے کا حکم نہیں، صرف کسی ایسے انداز میں اسے سمجھا دیا جائے جو اسے نہ تو برا محسوس ہو، نہ اس سے اس شخص کو ناگوار خاطر ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو خاموش ہو جائیں۔

اس حکم کے برعکس ہمارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ کھوج کھوج کر برائیاں تلاش کی جائیں، تلاش کر کر کے منفی پہلو اجاگر کیے جائیں، اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریکیوں کو عام کیا جائے۔

حال آں کہ جب تاریکی بڑھے گی تو روشنی خود بہ خود کم ہونے لگے گی اور اندھیرا چاہے کوئی کرے، کسی کا بھی اس میں ہاتھ ہو مگر اس کا شکار سب مل کر ہوں گے، پھیلنے والے اندھیرے کو برداشت سب ہی کو کرنا ہوگا اور اس کے نقصانات سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کے برعکس اگر ہر ایک اپنے حصے کی روشنی پھیلانا شروع کر دے تو تاریکی کے بادل خود بہ خود چھٹنا شروع ہو جائیں گے، جس کے نتیجے میں روشنی زیادہ قوت سے پھیلنا شروع ہو جائے گی، جس سے سب ہی فائدہ اٹھائیں گے، اپنی اپنی قسمت کے مطابق۔

بدگمانی سے بچنے کا حکم ہمیں قرآن بھی دیتا ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم میں ارشاد مبارک ہے:

وَلَا تَجَسَّسُوْا (۱)

تجسس میں مت پڑو۔

جب کہ ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہم معمولی معمولی باتوں میں بھی بدگمانی کا مظاہرہ کر کے خدائی حکم کی مخالفت کا باعث بن رہے ہیں اور اپنے ہی لیے تاریکیوں میں اضافہ کر رہے

۱۔ الحجرات: ۱۲

ہیں۔ وہ دین جسے دین رحمت کہا گیا، جسے انسانیت کے لیے روشنیوں کا ضامن بنا دیا گیا، اور جس نے تاریکیوں کو باقاعدہ ہدف بنا کر ختم کرنا شروع کیا آج اسی کے نام لیوا طرح طرح کی تاریکیاں پیدا کر رہے ہیں اور اندھیریوں کو دور کرنے کی بہ جائے ظلمات میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں، بدگمانی بھی ان ہی تاریکیوں میں سے ایک ہے۔

بدگمانی ایک بداخلاقی تو ہے ہی، یہ ایک نفسیاتی عارضہ بھی بن سکتی ہے اور ہم اگر خالص دنیاوی عینک استعمال کرتے ہوئے کاروباری نقطہ نظر سے بھی دیکھیں تو بدگمانی کی کیفیت اچھے بھلے کاروبار کو ناکام کر دینے کے لیے کافی ہے۔

جب انسان ہر بات کو منفی پہلو سے دیکھنا اور ہر چیز کے بارے میں منفی انداز سے سوچنا شروع کر دے تو مثبت پہلو خود بہ خود اس کی نظروں سے غائب اور منفی پہلو اپنے آپ اس کے سامنے روشن ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں اسے اچھائیاں نظر ہی نہیں آتیں اور برائیاں ہر سمت سے حملہ آور ہوتی دکھائی دیتی ہیں، اس وقت ایک عام اخلاقی برائی شدت کو پہنچ جاتی ہے اور ایک نفسیاتی عارضے کی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر اس کا چھوڑنا مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس برائی کی ایک قباحت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے ساتھ اپنی ہی جیسی کئی ایک سنگین برائیاں بھی ساتھ متعارف کراتی ہے، جن میں کینہ پروری اور دوغلہ پن سرفہرست ہیں۔ بدگمان شخص کینہ پرور بھی لازماً ہوگا اور منافق بھی، وہ نہ تو اپنی رائے کا کھل کر اظہار کر سکے گا نہ اپنے دل کی کیفیت کو بیان کر سکے گا، یہ وصف کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ اور اس کی قباحتیں اور نقصانات ہر ایک کے سامنے واضح ہیں۔

اسلام صاف صاف یہ درس دیتا ہے کہ ظاہر کو دیکھو اور اس پر اعتبار کرو پھر اگر کہیں سے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرو اور اس برائی کو عام مت کرو سوائے اس صورت کے جب عام لوگوں کو بھی اس سے دھوکہ اور ضرر پہنچنے کا یقینی خدشہ ہو، اور ہر شخص کے دل کا حال اس کے خدا پر چھوڑ دو وہی عالم الغیوب ہے، وہی سب کے دلوں کی اندرونی کیفیتوں سے مکمل طور پر واقف ہے، اور مآل کار ہم سب کو اس کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

خداوند کریم ہم سب کو کامل ایمان اور مکمل یقین کی دولت عطا کرے، آمین۔

امانت کا پاس

غزوۂ خیبر ایک نہایت اہم غزوہ ہے، سیرت طیبہ کے حوالے سے اس کی اہمیت مسلم ہے، اس کے اثرات مسلمانوں پر کئی اعتبار سے پڑے، لیکن اس وقت اس غزوہ میں پیش آنے والے ایک واقعے کا بیان مقصود ہے۔

اہل خیبر کے یہاں کسی یہودی کا ایک سیاہ فام غلام تھا، (ان کا نام دوسری روایت میں اسود راعی بیان ہوا ہے) یہ غلام اس یہودی کے ریوڑ کی خدمت پر مامور تھا، جب غزوۂ خیبر کے موقع پر لڑائی کا موقع آیا اور اس نے دیکھا کہ سب یہودیوں نے ہتھیار سجا لیے ہیں اور جنگ کے لیے تیار ہیں تو اس نے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے؟ کس سے لڑائی کی تیاریاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ہم ایک ایسے شخص سے لڑنا چاہتے ہیں جو اس امر کا دعوے دار ہے کہ وہ نبی ہے۔

اس شخص نے جب یہ بات سنی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کا اشتیاق اس کے دل میں پیدا ہوگیا، وہ اپنا ریوڑ لے کر باہر نکلا، اور بھیڑ بکریاں چراتا ہوا مسلمانوں کے لشکر کے قریب آگیا، مسلمانوں نے اسے دیکھا تو سے پکڑ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، آپ ﷺ سے اس نے چند سوالات کیے، اس نے کہا کہ آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ادعوک الی الاسلام، الی ان تشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله، والا تعبد الا الله

میں تمہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

اس غلام نے عرض کیا کہ اگر میں یہ گواہی دے دوں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الجنة، ان مت علی ذلک

اگر تم ایمان لے آئے تو تمہیں جنت ملے گی۔

وہ شخص فوراً مسلمان ہو گیا۔

اسلام لانے کے بعد اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایسا شخص ہوں جس کی رنگت کالی ہے، چہرہ بدصورت ہے اور جسم سے یہ بو اٹھ رہی ہے، میرے پاس کچھ مال و دولت بھی نہیں، اگر میں ان یہودیوں سے جنگ کروں اور اس میں شہید کر دیا جاؤں تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک، اس حبشی غلام نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہود کی بھیڑ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، میں ان کا کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں یہاں سے لے جاؤ اور قلعے کے پاس جا کر ان کو یہود کی بستی کی طرف ہنکا دو، یہ خود اپنے مالکوں تک چلی جائیں گی، اللہ تعالیٰ تمہاری امانت تمہاری طرف سے ادا فرما دے گا، چناں چہ اس غلام نے ایسا ہی کیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی امانت داری سے بہت متعجب ہوئے، بکریاں اپنے اپنے مالکوں تک پہنچ گئیں تو یہ شخص میدان عمل میں اترا اور یہود سے مقابلہ شروع کر دیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ یہ نو مسلم سابقہ یہودی غلام حضرت اسود راعی رضی اللہ عنہ راہ خدا میں شہید ہو گئے، انہیں اسلام لانے کے بعد جہاں میں شرکت کے سوا کوئی دوسری عبادت ادا کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ مسلمان انھیں اٹھا کر اپنے لشکر میں لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں میرے خیمے میں لے آؤ، چناں چہ انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمے میں لایا گیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فراغت ملی اور اپنے خیمے میں تشریف لائے تو انہیں دیکھا اور ان کے پاس جا کر فرمایا:

لقد حسن الله وجهک وطیب ریحک و کثر مالک

اللہ تعالیٰ نے تمہارے چہرے کو خوب صورت بنا دیا ہے، تمہارے جسم کی بو کو خوش بو سے بدل دیا ہے اور تمہارے مال کو بڑھا دیا ہے۔

پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

میں نے دو حوروں کو دیکھا کہ وہ ان کے چہرے پر لگی ہوئی گرد و غبار کو جھاڑ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ جس نے تیرے چہرے کو غبار آلود کیا ہے اللہ اس کے چہرے کو خاک آلود کردے اور جس نے تجھے شہید کیا ہے اللہ اسے ہلاک کرے۔(۱)

حضرت اسود راعی نے اپنی جو تین کم زوریاں بیان کی تھیں ان تینوں خامیوں کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ترین خوبیوں سے بدل دیا، اور محض چند لمحوں میں وہ شخص یہود کے ایک معمولی سے حبشی غلام کی حیثیت سے اوپر اٹھ کر اتنی بڑی کام یابی و کام رانی سے ہم کنار ہو گیا۔ رضی اللہ عنہ

اس واقعے میں ہمارے لیے بہت سے اسباق پوشیدہ ہیں لیکن ہم اس واقعے کا مطالعہ خاص نہج سے اور صرف ایک پہلو سے کریں گے، وہ ہے امانت و دیانت کا اسلامی تصور۔

غور کیجیے کہ لڑائی کا موقع ہے دو باہم متحارب قوتیں صف آرا ہو رہی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس از خود دشمن کی فوج کا ایک شخص دشمن کے مال کے ساتھ آتا ہے اور وہ آپ کے ہر حکم کو پورا کرنے کے لیے تیار ہے، حتی کہ وہ اپنا سب سے قیمتی متاع یعنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتا، پھر دشمن بھی کیسا؟ وہ دشمن جو گزشتہ کئی برسوں سے آپ کے لیے مسلسل مشکلات کا باعث بنا ہوا ہے، اس نے کسی موقع پر بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس نے ہر موقع پر اور ہر طرح سے مسلمانوں کو زک پہنچانے کی عملاً اور بھرپور کوشش کی، خفیہ بھی اور علانیہ بھی، کھلم کھلا میدان عمل میں سامنے آکر بھی اور دوستی کی شکل میں بھی۔ لیکن اس کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکم فرمایا؟ یہ کہ پہلے امانتیں ان کے مالکان تک پہنچاؤ، پھر آکر جہاد میں حصہ لو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اور امت کو پیش فرمودہ اسوۂ حسنہ تو ہمارے لیے مقام غور و فکر مہیا کرتا ہی ہے، خود حضرت اسود راعی کا یہ عمل بھی ہم جیسے پیدائشی اور برسوں سے اسلام کے لبادے میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کے لیے بہت سے اسباق اور عبرتیں اپنے

۱۔ سیرت ابن کثیر: ج ۴، ص ۳۵۲۔ امتاع الاسماع: ج ۱، ص ۲۳۹

اندر رکھتا ہے۔ ایک بالکل نو مسلم، جس نے ابھی صرف اسلام کا کلمہ پڑھنے اور اللہ کی وحدانیت کی شہادت دینے کے سوا کوئی عبادت تک ادا نہیں کی، اس کا فہمِ اسلام کس قدر بلند ہے؟ اس کی ذہنی وسعت کس قدر ہے کہ وہ امانت و دیانت کا اتنا اعلیٰ وارفع تخیل رکھتا ہے، اسے معلوم ہے کہ کسی کی امانت اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی اس کا ادا کرنا ضروری ہے، خواہ وہ امانت کسی مسلمان دشمن بلکہ جنگ پر آمادہ شخص کی ہی کیوں نہ ہو، اور امانت میں خیانت کی کوئی صورت بھی ایسی نہیں جسے اخلاقی اعتبار سے یا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز قرار دیا جاسکے۔

اب اس مرحلے پر اگر ہم اپنے انداز تربیت کا جائزہ لیں اور روز مرہ کے معاشی، معاشرتی، سماجی اور عمومی معاملات کا جائزہ لیں تو خیانت کی کوئی عملی صورت ایسی نہیں ملتی جو ہمارے درمیان رائج نہ ہو۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں امانت و دیانت کے کن بلند مراتب پر فائز ہونا چاہیے، اس کا کوئی تصور ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔

غور کیا جائے تو یہ افسوس ناک حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہم عملی طور پر امانت و دیانت کا جس قدر اعلیٰ وارفع تصور رکھتے ہیں اور جس قدر بلند مرتبہ تعلیمات و روایات کے وارث ہیں، عمل کے میدان میں آج اسی قدر کمزور و پست مرتبے کے حامل ہیں۔

مغرب کے بارے میں یہ بات بجا طور پر درست ہے کہ ان کے تصورات دو طرح کے ہیں، ایک مقامی سطح پر لاگو ہونے والے، دوسرے بین الاقوامی معاملات میں جن پر ان کا مدار ہے، دونوں صورتیں باہم مختلف ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ہم تو دونوں ہی صورتوں میں بدترین اخلاقی بدعنوانی کا شکار ہیں، ان کے ہاں عوامی اور مقامی سطح پر اس طرح کی بدعنوانی اور امانت میں خیانت کا تصور تک ممکن نہیں جو ہمارا روز مرہ کا معمول ہے، (اگرچہ وہ بین الاقوامی سطح پر ہر قسم کے دھوکے، فریب اور ظلم کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں) مغرب پر تنقید بجا، لیکن کیا اس اخلاقی کمزوری کے ساتھ اس کا عملی طور پر مقابلہ ممکن ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین۔

عدل کا مفہوم

حضرت صخر رضی اللہ عنہ ایک عرب سردار ہیں، جب غزوۂ طائف ہوا تو اہل طائف کو مصالحت پر آمادہ کرنے میں ان ہی کی کاوشوں کا دخل تھا، ان کا یہ کارنامہ عہد نبوی کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے، اس اعتبار سے وہ خصوصی اعزاز کے مستحق تھے۔ لیکن ایک مرتبہ حضرت مغیر بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی کہ ان کی پھوپھی حضرت صخر کے قبضے میں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سن کر فیصلہ فرمایا کہ انہیں نہ صرف چھوڑ دیں بل کہ انہیں ان کے گھر پہنچا کر آئیں، اس واقعے کے بعد بنوسلیم حضرت صخر کے بارے میں ایک اور شکایت لے کر آگئے، شکایت یہ تھی کہ جس زمانے میں وہ ایمان نہ لائے تھے حضرت صخر رضی اللہ عنہ نے ان کے پانی کے چشمے پر قبضہ کرلیا تھا اور اب چوں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں اس لیے ان کا چشمہ انہیں لوٹا دیا جائے، یہ شکایت معقول تھی اور مبنی بر حقیقت بھی، اس لیے نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوسلیم کے حق میں فیصلہ فرمایا دیا اور حضرت صخر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرلیتی ہے تو وہ اپنے مال اور جان کی مالک ہوجاتی ہے، اس لیے ان کا چشمہ انہیں واپس کردیا جائے۔

یہاں ہمارا مقصد اس جملے سے ہے، جو یہ قصہ بیان کرنے کے بعد راوی نے بیان کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں فیصلے اگرچہ حضرت صخر رضی اللہ عنہ کے خلاف ہوئے مگر انہوں نے بغیر کسی تذبذب کے دونوں کو قبول کرلیا، مگر جب انہوں نے دونوں فیصلے قبول کرلیے تو شرم کی وجہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور سرخ ہوگیا، راوی کے الفاظ یہ ہیں:

وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتغیر عند ذلک حمرۃ حیاء من

اخذہ الجاریۃ و اخذہ الماء (۱)

صخر سے ان کی باندی واپس لینے کی اور پانی پر سے ان کا قبضہ ختم کرنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر شرم کی وجہ سے سرخی آگئی۔

کیوں کہ حضرت صخر رضی اللہ عنہ اپنی سابقہ خدمات کی وجہ سے خصوصی رعایت اور امتیازی سلوک کے مستحق تھے، نہ کہ مقدمات میں مسلسل انکے خلاف فیصلہ کیا جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر شرم محسوس کی کہ وہ اسلامی حکومت کے لیے اس قدر اہم خدمت انجام دینے کے باوجود کسی اعزاز سے نوازے نہ جاسکے، الٹا انہیں اپنے خلاف دو فیصلوں کو قبول کرنا پڑا۔

یہ واقعہ ہمارے لیے ایک اہم درس کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اس میں عدل و انصاف کا وہ بلند معیار پیش کیا گیا ہے، جس کی مثال آج کی ہماری دنیا میں نظر آنی عملاً ناممکن ہوگئی ہے، غیر مسلموں سے تو کوئی شکایت نہیں کہ وہ ہمارے مخاطب ہی نہیں، بات تو ان کی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ماننے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اٹھتے بیٹھتے اپنانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی باتیں بھی کرتے ہیں، لیکن جب عمل کا مرحلہ آتا ہے تو ہم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی بہ جائے ایک دوسرے سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس واقعے میں حضرت صخر رضی اللہ عنہ کا عمل بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے، انہوں نے اپنی سابقہ امتیازی حیثیت کو اپنے لیے کمزوری نہیں بنایا بل کہ شریعت کے فیصلے کو دل و جان سے تسلیم کرلیا، اگرچہ اس میں انہیں وقتی طور پر پس پائی اختیار کرنی پڑی کہ دونوں فیصلے واضح طور پر ان کے خلاف جارہے تھے، لیکن ان کو یہ فیصلہ قبول کرنے میں کسی تذبذب کا شکار نہیں ہونا پڑا، یہ ان کے کامل ایمان کی واضح نشانی تھی، انہوں نے یہ فیصلے قبول کرکے اسلامی ریاست کو آزمائش سے بھی بچالیا جس سے وہ ان کے فیصلے قبول نہ کرنے کی صورت میں دوچار ہوسکتی تھی۔

۱۔ ابوداؤد: ج ۳، ص ۱۱۳۔ رقم ۳۰۶۷

درحقیقت انصاف اور عدل کا یہ سب سے مشکل مرحلہ ہے، یعنی اپنے خلاف ہونے والے عدل کو بہ خوشی برداشت و قبول کرنا، ورنہ مزاجاً اور طبعاً ہم صرف اس عدل کو عدل و انصاف تصور کرتے ہیں جس کے نتیجے میں مکمل طور پر ہمیں فوائد حاصل ہوں اور جس عدل میں ہم پر تھوڑی سی زد بھی پڑتی ہو وہ ہمارے لیے نہ صرف قابل قبول نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمارے نظر میں عدل کی تعریف پر بھی پورا نہیں اترتا۔

درحقیقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عدل و انصاف کی ہمیں تلقین فرمائی ہے، اس کا آغاز ہی اپنی ذات سے ہوتا ہے، اسلام کی نظر میں عدل و انصاف کے معاملے میں کسی کو بھی استثنائی امتیاز حاصل نہیں، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر بھی قوانین انصاف کا اطلاق اسی طرح کرتے تھے جیسا کہ دیگر مسلمانوں اور غیر مسلم رعایا پر کرتے تھے۔

چناں چہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے دوران ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گیا جس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیزے سے اسے زخم آ گیا اور اس کا چہرہ زخمی ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدلہ لینے کی فوراً پیش کش کر دی، اگر چہ اس نے معاف کر دیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ نہیں سمجھا، اسی طرح اس دنیا سے پردہ فرمانے سے قبل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار مجمع عام میں یہ اعلان فرمایا کہ اگر کسی کا کوئی حق یا رقم وغیرہ میرے ذمے ہے تو وہ حاصل کر لے یا معاف کر دے، اس کے جواب میں صرف یک شخص نے محض چند درہموں کا ذکر کیا، جس کی ادائیگی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا جنہوں نے فوراً ادائیگی کر دی۔ (۱)

یہ واقعات عام نوعیت کے نہیں ہیں، اگر چہ ہم انہیں پڑھتے ہیں مگر سرسری انداز میں، اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، لیکن ان مین ہمارے لیے جو سبق پوشیدہ ہے، جو درس عمل مضمر ہے، وہی ہماری توجہ کی اصل چیز ہے، اسی کو ہم نے حرزِ جاں بنانا ہے، وہ ہے عدل و انصاف کو کس طرح ہماری زندگیوں کا عملی طور پر حصہ بنایا جا سکتا ہے؟

۱۔ مجمع الزوائد: ج ۸، ص ۵۹۷ رقم ۱۴۲۵۲

ایک جانب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو نظر میں رکھیں، دوسری جانب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہ کا تصور کریں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ان واقعات پر غور کریں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات میں اپنی ذات کا عدل وانصاف کے مروجہ قوانین سے استثنا فرما لیتے تو کیا کسی جانب سے آپ کی تردید کی صدا بلند ہونے کا امکان تھا؟ یقیناً نہیں بل کہ بعد میں بھی اگر کبھی ایسا موقع پیش آیا اور کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی کوئی جسارت کی بھی تو اس میں بھی خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تعلیمات کا ہی دخل تھا۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کی اہمیت اور قدر و قیمت کو اور بڑھا دیتی ہے، اگر ہم اس پر غور کرنے کی کوشش کریں۔

اگر چہ ان میں بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کا تعلق امور حکومت و قوانین ریاست سے ہے اور ان سے حاصل ہونے والے سبق کا تعلق بھی حکومت و ریاست کے ذمے داروں سے ہے، ہم جیسا ایک عام شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ یہ سب تو ہمارے دائرہ اختیار ہی میں نہیں آتا، یہ بات اگر درست بھی ہو تو کسی حد تک ہی درست ہوگی، کیوں کہ ان واقعات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے عدل وانصاف کا جو درس ہمیں مل رہا ہے، وہ محض انصاف کا ہے، اس کی کسی خاص صورت کا نہیں، ہم اپنی زندگیوں کا سنجیدگی اور خود احتسابی کی نظر سے جائزہ لیں تو یقیناً یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ دن رات میں بہت سے مواقع ایسے ہمیں پیش آتے ہیں جب ہم اسوۂ حسنہ کے اس پہلو پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ وہ مواقع آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، ہمیں اس جانب توجہ ہی نہیں ہو پاتی۔

آخر جس کسی کا حق ہماری ذات سے وابستہ ہے، اسے دیانت داری سے مکمل طور پر ادا کر دینا بھی عدل ہی تو ہے، اور اس انسانی بستی میں بسنے والا وہ کونسا شخص ہوگا جس کے ذمے کسی کا حق نہ ہو یا جس کی ذات سے کسی کے بھی حقوق وابستہ نہ ہوں؟ غور کریں تو بہت سی ایسی صورتیں ہمارے سامنے آسکتی ہیں، جہاں ہم سے اس سلسلے میں کوتاہی ہوتی رہی ہے، مگر وہ سب ماضی کا حصہ بن چکا، اور بہتر ماضی وہی ہے جو حال و استقبال کے لیے بہترین رہنما ثابت ہو۔

اللہ تعالیٰ راہِ عمل پر چلنا ہمارے لیے آسان فرمائے۔ آمین

وسائل کی قدر قیمت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کر آؤ واقفی کے پاس چلتے ہیں، یہ ایک انصاری صحابی تھے، ان کا ایک باغ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں رفقا کے ساتھ ایک چاندنی رات میں وہاں پہنچے، واقفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے، خوشی سے ان کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے، انہوں نے خوش آمدید کہا اور چھری لے کر اپنی بکریوں میں چکر لگانے لگے کہ مہمانوں کی ضیافت کے لیے کون سی بکری ذبح کی جائے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عجیب جملہ ارشاد فرمایا، ایک جملہ، صرف دو لفظ، لیکن ان میں ایک پورا جہانِ حکمت اور کام یاب زندگی کا اہم ترین اصول موجود تھا، آپ نے فرمایا:

ایاک والحلوب (۱)

دیکھو دودھ والی بکری ذبح نہ کرنا۔

یہ واقعہ جہاں ایک جانب ہمارے لیے بہت سبق آموز ہے، وہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت، دور اندیشی بل کہ آج کے زبان میں آپ کے ویژن کو بھی ہمارے سامنے واضح کرتا ہے۔ اس واقعے میں دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ہدایت یہ فرما رہے ہیں کہ اگر جانور ذبح کرنا ہو تو ضرور کیا جائے، یہ ہماری خوارک کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں، لیکن اگر کوئی جانور دودھ دینے والا ہے، تو اس سے چوں کہ مزید فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس لیے اس کی حفاظت کرنی چاہیے، گوشت ہمیں کہیں اور سے بھی مل جائے گا، مگر دودھ ہر جگہ

۱۔ ابن ماجہ: ج ۲، ص ۳۵۸، رقم ۳۱۸۰

سے حاصل نہیں ہوسکتا، اس لیے ہمیں دودھ دینے والے جانوروں کی قدر کرنی ہوگی، کہ یہ انسانی وسائل کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہے۔

اس انسانی دنیا میں موجود تمام وسائل انسان ہی کے استعمال کے لیے ہیں، اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ قانون کے مطابق دنیا میں موجود ہر طرح کی مخلوق حضرت انسان کی خدمت ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے، لیکن ہمارے لیے جاننے اور سمجھنے کا اصل سبق یہ ہے کہ یہ تمام وسائل بہ قدر ضرورت ہی استعمال کے لیے ہیں، بے دریغ اور بلا ضرورت استعمال کرنے، اور بے دھڑک ضائع کرنے کے لیے نہیں۔ چناں چہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ سہولت موجود ہو تو اچھے سے اچھا کھانا اور اچھے سے اچھا پہننا بھی کوئی برائی نہیں، لیکن کھانے سے زیادہ برباد کر دینا، پہننے سے زیادہ ضائع کر دینا، دکھلاوے میں وسائل کا بے تحاشا استعمال اور پیسوں کو ہوا میں اڑا دینا، سخت ناپسندیدہ طریقہ ہے۔ عملی زندگی میں تو یہ راستہ سیدھا ناکامی کی طرف جاتا ہے۔

ان تمام امور کو خالص دنیاوی لحاظ سے بھی دیکھیں تو بھی وسائل کا ضائع کرنا بہ جائے خود ظلم اور اس کائنات اور اس میں موجود طرح طرح کی مخلوقات کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ وسائل، اپنی صلاحیتیں، مال و دولت، وقت، قوت و اختیار، منصب اور ذمے داری ہر چیز کو انسان نے اگر احتیاط سے استعمال کرنا سیکھ لیا تو وہ کام یاب ہے، اور اگر وہ ان میں توازن نہ رکھ سکا، اور یہ طے نہ کر سکا کہ ان میں کوئی سی چیز ضرورت ہے اور کہاں ہم ضرورت کی حد سے نکل کر اسراف اور فضول خرچی کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں تو وہ کام یابی سے دور ہوتا چلا جائے گا۔

ہمارے ہاں بہت سی بڑی بڑی ناکامیوں کی بنیاد صرف اور صرف وسائل کا ضائع کرنا ہے۔ جہاں دو افراد کام کر سکتے ہیں، وہاں دس افراد لگا دیتے ہیں، جہاں دس افراد سے کام ہوسکتا ہے، وہاں سو افراد جھونک دیتے ہیں، جہاں ایک دفتر کافی ہوتا ہے، وہاں ہم دفاتر کی چین قائم کر دیتے ہیں۔ یہ اسراف ہر چیز میں نظر آتا ہے، ایک میز کرسی کی ضرورت ہو تو پورا فرنیچر سیٹ ہماری امارت پسندی کی تسکین کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ادارے وژن سے چلتے ہیں، شخصیات اپنی کام یابی کی راہیں اپنے ذہن اور اپنی محنت سے متعین کرتی ہیں، نہ وہ اپنے

کپڑوں کی تراش خراش سے یہ کام یابیاں سمیٹ سکتے ہیں، نہ اپنے لمبے چوڑے دفاتر یا بھاری بھرکم فرنیچر کے زور پر کام یاب قرار پا سکتے ہیں، جو کام ہم لمبے چوڑے دفاتر میں بیٹھ کر انجام دیتے ہیں، دنیا میں چھوٹے چھوٹے دفاتر میں بیٹھ کر ہو جاتا ہے، اور شاید ہم سے اچھا اور معیار میں ہم سے بہتر ہوتا ہے، وہ کام یاب ہیں، ہم بھی انہیں کام یاب مانتے ہیں، اور ہم کام یابی کی تلاش میں مسلسل سرگرداں، مگر کام یابی سے کوسوں دور۔

درحقیقت انسان عجیب وغریب مزاج لے کر پیدا ہوا ہے، یہ گھڑی میں تولا اور گھڑی میں ماشہ ہوتا ہے، غربت میں اس کا چلن کچھ اور ہوتا ہے، اور امارت میں اس کا ڈھب الگ۔ یہ تیزی سے رنگ بدلتا ہے۔ انسان کو اگر وسائل میسر نہ ہوں تو انتہائی قلیل وسائل میں بھی یہ بہت کچھ کرنے کی قوت رکھتا ہے، اور اگر وسائل کی فراوانی ہو تو انہیں ضائع کرنے کے بھی ایسے ایسے راستے سوچ لیتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس لیے اس نوعیت کی ہدایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے، تاکہ ہم ناکامی سے بچ سکیں اور اس راہ میں قدم قدم پر پڑنے والی ٹھوکروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں فہم، فراست اور سمجھ عطا فرمائے۔

نظافتِ طبع

ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے کپڑے میلے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوال کیا کہ کیا تم مال دار ہو؟ صحابی رسول رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ان کے مال کی تفصیل دریافت کی، انہوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ، بکریاں، گھوڑے، لونڈیاں اور غلام غرض ہر طرح کے مال و دولت سے نوازا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فاذا اتاک اللہ مالا فلیر اثر نعمۃ اللہ علیک و کرامتہ (۱)

جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت سے نوازا ہے، تو اس کا اثر بھی تم پر نظر آنا چاہیے۔

اسی طرح ایک صحابی کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حالت میں دیکھا کہ ان کا حلیہ پراگندگی کا شکار تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اما کان ہذا یجد ما یسکن بہ شعرہ

اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ سر کے بال درست کر لے۔

اسی طرح اس کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا:

اما کان ہذا یجد ما یغسل بہ ثوبہ (۲)

کیا اسے پانی نہیں ملتا کہ وہ اپنے کپڑے ہی دھو لے۔

۱۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۱۷، رقم ۴۰۶۳

۲۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۱۷، رقم ۴۰۶۲

صفائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزاج اور طبیعت کا حصہ تھی، اس لیے آپ کو ہر برائی اور کراہت آمیز چیز سے نفرت تھی اور صفائی اور نظافت پسند تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت سی ہدایات اس ذیل میں آتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بنی الدین علی النظافة (۱)

دین کی بنیاد صفائی ستھرائی پر رکھی گئی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

الطہور شطر الایمان (۲)

صفائی ایمان کا حصہ ہے۔

اسی طرح بہت سی روایات ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی تلقین فرمائی، مثلاً جمعے کے لیے خاص طور پر غسل کی تاکید کی اور اس کا سبب یہی تھا کہ چھوٹی مسجد کے سبب گرم موسم میں نمازیوں کے پسینے کی بو سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی، پھر ناخن اور فالتو بالوں کو تاکید سے صاف کرنے کا حکم دیا، کھانے پینے سے پہلے ہاتھ دھونے کی تاکید کی اور طہارت اور پاکی کے مسائل کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا، یہ تمام باتیں اس لیے تھیں کہ صفائی جس طرح ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہماری زندگی کا حصہ بھی بن جائے اور ہماری طبیعت میں نظافت کا عنصر غالب آ کر ہماری فطرت ثانیہ کی شکل اختیار کر جائے۔

جب ہمارے دین میں صفائی کی اس قدر تاکید ہے، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بھی ہمارے دینی معاملات ہیں، اگر چہ یہ ہماری زندگی اور اس کے معاشرتی اور ذاتی پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان کا چوں کہ ہمارے دین سے بھی گہرا تعلق ہے اور دوسری ہدایات اور احکامات کے ساتھ ساتھ ہمارے دین ہی نے صفائی اور نظافت کے بھی تفصیلی احکامات دیے ہیں، اس لیے اس پہلو پر ہماری توجہ زیادہ ہونی چاہیے۔ اس صفائی میں تمام وہ پہلو شامل ہیں، جو انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، البتہ ان کی اہمیت کم زیادہ ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر

۱۔ قاضی عیاض۔ الشفاء: ج ۱، ص ۳۹

۲۔ مسلم: ج ۱، ص ۱۷۱، رقم ۲۲۳

اس صفائی میں انسان کے جسم کی صفائی بھی شامل ہے، اس کے کپڑوں کی بھی، اسی طرح اس کے گھر کی صفائی بھی شامل ہے، اور اس کے محلے اور شہر کی بھی، ہمارا رویہ اس بارے میں اصلاح کا تقاضا کرتا ہے، ہم عام طور پر اپنے گھروں کو اندر سے صاف کر کے باہر کے حصے کو خراب کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ صفائی کے احکامات پر ادھورا عمل ہے، ان احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کچرے کو اس طرح ٹھکانے لگایا جائے، جس سے گھر بھی صاف ہو جائے اور باہر کا حصہ بھی آلودہ نہ ہو۔

اس سلسلے میں ایک اور پہلو ہماری نظروں سے زیادہ تر اوجھل رہتا ہے، وہ ہے پڑوسیوں کے حقوق، اپنا کچرا پڑوسی کے دروازے پر پھینک دینا ایک ناجائز اور تکلیف دہ عمل ہے۔ جس کی نہ صرف یہ کہ اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ بل کہ اس کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں، مثلاً یہ حقوق العباد کی نفی ہے، اور ایذائے مسلم میں بھی شامل ہے۔ اور یہ تمام باتیں شریعت کی نظر میں ممنوع ہیں۔

یہ صفائی کے حوالے سے چند صورتیں تھیں، عملی اعتبار سے اس کی حقیقت وسیع ہے اور اس کی اہمیت دو چند ہے، اسلام صفائی اور نظافت کو انسانی مزاج کا حصہ بنانا چاہتا ہے، کیوں کہ ظاہری صفائی کا باطن پر اچھا اثر پڑتا ہے اور ظاہری پراگندگی باطنی خرابیوں کو جنم دیتی اور انہیں پروان چڑھاتی ہے، اور باطن انسانی جسم کا وہ غیر مرئی حصہ ہے جس پر انسانی مزاج اور طبیعت کا سارا دارومدار ہے، وہ تمام برائیاں جو انسانی طبیعت اور مزاج کو بہ راہ راست متاثر کرتی ہیں، ان کا تعلق انسان کے باطن سے ہی ہوتا ہے۔

یہ بات عام مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہے کہ صفائی اور نظافت انسان کے ہر پہلو کو متاثر کرتی ہے، جو شخص نجی زندگی میں نظافت پسند ہوتا ہے، اس کے مزاج میں بھی نظافت ہوتی ہے اور اس کا اثر ہر پہلو سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنے گھر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر گھر سے باہر معاشرے پر بھی اس کے مثبت اثرات پڑتے ہیں، اس سے ملنے جلنے والے بھی ان مثبت اثرات کو قبول کرتے ہیں، وہ نہ صرف خود صفائی کا خاص خیال رکھتا ہے، بل کہ وہ عملی طور پر صحت وصفائی کا چلتا پھرتا داعی بھی ہوتا ہے، یوں خیر کا یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح نظافت پسند شخص صرف اپنے جسم اور کپڑوں ہی میں صفائی کا مظاہرہ نہیں کرتا

بل کہ عملی زندگی میں بھی اس کی صفائی پسندی اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے، اور اس کی نشست و برخاست، خلوت وجلوت اور تحریر وتقریر، رہن سہن سب ہی میں اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے تو صاف اور ستھرے اسلوب مین، تقریر کرتا ہے تو فصاحت و بلاغت اس کی بلائیں لیتی ہے، لوگوں سے ملاقات کرتا ہے تو شائستگی اس کا تعارف بنتی ہے، کسی سے کوئی معاملہ کرتا ہے تو معاملے کی صفائی اسے انسانوں کی اس بھیڑ میں دوسروں سے نمایاں اور ممتاز کر دیتی ہے۔ اور یوں صفائی اور ستھرائی ہر صورت میں اپنا رنگ دکھا کر رہتی ہے۔

اس کے برعکس انسان کا صاف ستھرا نہ رہنا ایک سماجی برائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کی پراگندگی کا اثر صرف اس کے ظاہر تک محدود نہیں رہتا، بل کہ وہ متعدی ہو کر پہلے اس کے گھر اور پھر بتدریج پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ صفائی انسانی مزاج اور طبیعت کا خاصہ ہے، جسے پروان چڑھانا ایک صحت مند معاشرے کے لیے از حد ضروری ہے، اسی لیے صفائی اسلام کی اولین ترجیح بھی ہے اور اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے۔

پھر اس بات کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ گندگی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ ایک صاف ستھرا معاشرہ زیادہ بہتر طور پر بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور صحت مند، برائیوں، بیماریوں اور ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک اور محفوظ معاشرہ ہی اسلام کو مطلوب ہے۔

انسان کی بڑائی

ایک سفر کا واقعہ ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں کسی پڑاؤ پر کھانے کا وقت ہوا ایک صحابی نے بکری ذبح کی اور کھانا تیار کرنے کے تمام کام آپس میں تقسیم کر لیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ تمام کام ہم انجام دے لیں گے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قد علمت انکم تکفونی، ولکن اکرہ ان اتمیز علیکم، فان اللہ یکرہ من عبدہ ان یراہ متمیز أبین اصحابہ (۱)

میں جانتا ہوں کے تم یہ کام کر سکتے ہو مگر مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں تم سے ممتاز ہوں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کا بندہ اپنے ساتھیوں میں اپنے آپ کو ممتاز دیکھنا چاہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی واقعہ نہیں تھا، بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والا ایسے ان گنت مواقع سے آشنا ہوتا ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام خود اپنے دستِ مبارک سے انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے متعدد صحابہ کرام سے روایت ہے:

کان یخدم نفسہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امور اپنے ہاتھ سے نمٹایا کرتے تھے۔

۱۔ زرقانی: ج ۴، ص ۲۶۵

چناں چہ جب ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی اور گھریلو رہن سہن کی بابت پوچھا گیا تو انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگالیا کرتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا سلف لے آتے، اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے گانٹھ لیتے، ڈول میں ٹانکے لگالیتے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے، اس کو چارا ڈال دیتے اور غلام کے ساتھ مل کر آٹا بھی گوندھ لیتے تھے۔(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مقام اور ہر جگہ پر صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے کہ کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا، اور آپ اپنے لیے کسی قسم کا کوئی امتیاز پسند نہیں فرماتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ انصاری جنہوں نے اس سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نہیں کی تھی آپ کو پہچان نہیں سکے تھے اور وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ کر انہیں سلام کرنے لگے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دھوپ آگئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ پر اپنی چادر سے سایہ کرلیا، اس وقت لوگوں کو علم ہوا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔(۲)

قریش مکہ کی ایک خاص عادت تھی کہ وہ حج کے موقع پر دوسرے عرب کی طرح عرفات میں اپنے قیام کو عار سمجھتے تھے اور وہ اپنے آپ کو حُمس (شدت وحیثیت والے) کہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہم اہل اللہ ہیں اور حرم کے رہنے والے ہیں اس لیے حدودِ حرم سے باہر جانا ہمارے لیے مناسب نہیں، یہ بہانہ کر کے وہ مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے تھے، کیوں کہ مزدلفہ حدودِ حرم میں ہے اور عرفات اس سے باہر ہے۔(۳)

اس طرح انہوں نے اپنے لیے ایک امتیاز کا طریقہ قائم کرلیا تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ

۱۔ زرقانی: ج۴، ص ۳۰۴

۲۔ زرقانی: ج۱، ص ۳۵۰

۳۔ تفسیر مظہری: ج۱، ص ۲۳۶

وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس امتیاز کو بھی ختم فرما دیا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ عرفات میں قیام کرنے لگے۔(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا اور یہ انداز آپ کی عادت کا حصہ تھا، اس بنا پر ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی انداز ہمیں ملتا ہے۔ غزوۂ خندق کا واقعہ کس کے ذہن میں نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح عام مزدوروں کی مانند کھدائی کے تمام مراحل میں بہ نفس نفیس شرکت فرمائی، پتھر اٹھا اٹھا کر رکھے، اپنے ہاتھوں سے کھدائی کی، پہرا دیا اور جب مشقت اور بھوک کی شکایت کرتے ہوئے صحابہ کرام نے اپنے پیٹوں سے بندھے ہوئے پتھر دکھائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دکھایا کہ ایک کی جگہ آپ کے شکم مبارک کے ساتھ دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

اس سے قبل جب مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر کے مرحلے آئے، تب بھی کسی ادنیٰ امتیاز کے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں شرکت فرمائی۔ ان واقعات میں بھی ہمارے لیے اور ہماری عملی زندگی کے لیے بہت سے سبق، عبرتیں اور بہت سے درس پوشیدہ ہیں۔ کاش کہ ہم (میں اور آپ) انہیں سمجھ سکیں اور پھر ان پر دل وجان سے عمل پیرا ہو سکیں۔

سب سے پہلا سبق ہمیں جو ملتا ہے، وہ یہ کہ امیر کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جسمانی یا ذہنی کسی سطح پر بھی دوسروں سے بہتر نہ سمجھے اور خود کو ان سے کسی بھی سطح پر ممتاز کرنے اور نمایاں ہونے کی کوشش نہ کرے۔

دوسرا درس اس میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ انسان خواہ کس قدر ہی بلند و بالا مرتبے کا حامل کیوں نہ ہو جائے اپنے کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے میں نہ کوئی عار ہے نہ اس سے حیثیت (اسٹیٹس) کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، نہ اس سے اس کی شان میں کسی قسم کی کوئی کمی آتی ہے بل کہ دیکھا جائے تو اپنے ہاتھ سے اپنے کام کی انجام دہی خود اس کی شخصیت کو بلند کرتی ہے اور اس کے مراتب میں لوگوں کی نظر میں بھی اور اللہ کے ہاں بھی اضافہ ہی ہوتا ہے۔

اس لیے اگر انسان کسی مقام پر پہنچنے کے بعد بھی اگر اپنا سامان خود اٹھا لیا کرے، اپنے

۱۔ نسائی: کتاب المناسک، باب رفع الیدین فی الدعاء بعرفہ

روزمرہ کے امور بغیر کسی عار کے خود انجام دے لیا کرے، اپنا سودا سلف خود لانے میں کوئی تامل نہ ہو، اسے اپنا بریف کیس خود اٹھانے میں کوئی شرمندگی محسوس نہ ہوتی ہو، اور اپنا قدم آگے بڑھا کر عام انسانوں کی طرح اپنا جوتا اپنے پاؤں میں خود ڈال لینے میں اسے کسی قسم کی تحقیر کا احساس نہ ہوتا ہو تو اس سے اس کی شخصیت کا تاثر کم زور نہیں پڑے گا، اس کا مقام کم نہیں ہوگا اور نہ اس کے مرتبے میں کسی طرح کی کوئی کمی آئے گی۔ سیرت طیبہ کا یہی درس ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمیں یہی سکھاتا ہے۔

دیکھا جائے تو ہمارے یہ رویے ہماری اجتماعی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں، صرف ذرا سی احتیاط اور معمولی سی کوشش سے انسان اپنے لیے اور اپنے متعلقین، احباب، اہل خانہ، اہل محلہ اور اہل معاشرہ کے لیے سہولتیں پیدا کرسکتا ہے، ان کو راحتیں دے سکتا ہے، ورنہ کم از کم ان کے لیے مزید مشکلات اور مشقتوں کا باعث نہیں بنتا، جب کہ معمولی سی سہل پسندی، ذرا سی لاتعلقی اور تھوڑی سی انا پرستی کو پروان چڑھانے سے پورا معاشرہ رفتہ رفتہ طرح طرح کی مشقتوں اور نئی نئی مشکلات سے دوچار ہوجاتا ہے۔

اس طرح کے رویوں کے بہت سے پہلو ہیں۔

۱۔ مثلاً اس کا تعلق حقوق العباد سے بھی بنتا ہے۔

۲۔ بعض صورتیں اس میں ایسی بھی پیش آجاتی ہیں جس میں مسلمانوں کو ایذا رسانی کی شکل پیدا ہوسکتی ہے۔

۳۔ بعض صورتوں میں اپنے ہم پلہ مسلمان بھائیوں کی تحقیر کا امکان بھی پیدا ہوجاتا ہے۔

۴۔ پھر اس صورت میں اگر انا پرستی کا عنصر غالب آجائے تو تکبر کی علامات جنم لیتی ہیں جو انسانی شخصیت کے لیے مسلسل خطرہ ہیں۔

اس لیے اگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہم پیش نظر رکھیں اور اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے رہ نمائی حاصل کرتے ہوئے اپنے لیے راہ متعین کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ خود ہماری مشکلات کم نہ ہوں اور ہمیں بہت سی مشقتوں سے نجات نہ ملے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے اور سیرت طیبہ سے سبق حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

یقین محکم

سال ۱۳ نبوی کا ذکر ہے، مدینے سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ایک گروہ کو اپنے ہم راہ لے کر حج کی ادائیگی کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، مسلمانوں کے اس گروہ کی تعداد ۷۵ بیان کی جاتی ہے۔ ان مسلمانوں نے ایام تشریق میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر شہر سے باہر ایک گھاٹی میں بیعت کی۔ اس سے قبل ایک سال پہلے اسی گھاٹی میں انصار مدینہ کے کوئی بارہ افراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر چکے تھے، اس بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور دوسری بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ نو مسلم تھے، مگر ایمان کے اس قدر پختہ اور عملی طور پر اس قدر متحرک اور دینی جذبات سے آراستہ کہ انہوں نے فوراً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ آنے کی دعوت دے دی۔ یہ دعوت کوئی رسمی دعوت نہ تھی، اس کے خطرناک مضمرات اور دور رس نتائج مرتب ہو سکتے تھے، ان خطرات سے یقیناً یہ مسلمانان مدینہ بھی واقف تھے، مگر ان کے ایمان کا اعجاز ملاحظہ کیجیے کہ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا، کوئی تردد انہیں پیش نہیں آیا، کسی قسم کے تذبذب کا شکار نہیں ہوئے اور ہر وہ طرح کے خطرات مول لینے پر تیار ہو گئے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس وقت تک اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور اسلام کے لیے خیر خواہی کے جذبات رکھتے تھے، وہ اس ملاقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے، انہوں نے ان خطرات کو محسوس کیا اور انصار مدینہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

یامعشر الخزرج، ان محمد آمنا حیث قد علمتم وقد منعناہ من

قومنا، ممن هو علی مثل رأينافيه، فهو فی عز من قومه ومنعة فی بلده، وأنه قد أبی الا الانحياز اليكم، واللحوق بكم، فان كنتم ترون أنكم وافون له بما دعوتموه اليه، ومانعوه ممن خالفه، فأنتم وماتحملتم من ذالک، وان كنتم ترون أنكم مسلموه و خاذلوه بعد الخروج به اليكم، فمن الآن فدعوه، فانه فی عز ومنعة من قومه و بلده

اے لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے ہاں محفوظ ہیں، اور ہم ان کی حفاظت کے ذمے دار ہیں، جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی قوم میں احترام اور عزت کے مقام کے حامل ہیں اور ہم ان کے حامی و مددگار ہیں، تم ان سے کوئی عہد یا اقرار لینے سے پہلے سوچ لینا (کہ یہ نازک اور مشکل کام ہے) جو قدم بھی اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ اگر تم اپنا وعدہ پورا کر سکو تو بہتر ہے، ورنہ بہتر ہے کہ خاموش ہو جاؤ، اور ابھی کہہ دو تاکہ تمہیں بعد میں شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور دشمنوں کی عداوت کا نشانہ نہ بننا پڑے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ خطاب جس کے الفاظ تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں اور جن الفاظ کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، کہنے کو تو مختصر الفاظ ہیں، مگر ان کی تہہ میں جو تنبیہات چھپی ہوئی ہیں، جن خطرات سے وہ آگاہ کر رہے ہیں وہ معمولی حیثیت نہیں رکھتے، وہ اتنے سرسری نوعیت کے نہیں جنہیں نظر انداز کیا جا سکے، مگر تاریخ ہی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اس قدر سخت تنبیہ، اس قدر واضح موقف کے باوجود اس وقت موجود انصار سے ایک نے بھی اپنے وعدے، اپنے اقدام اور اپنے ارادے پر کسی طرح سے پشیمانی کا اظہار بھی نہیں کیا، اپنی رائے تبدیل نہیں کی، حتیٰ کہ اپنے موقف پر دوبارہ غور و فکر کرنے کے لیے چند لمحوں کی مہلت بھی نہیں طلب کی، بل کہ کہا تو صرف اس قدر کہ:

اے عباس (رضی اللہ عنہ) آپ نے جو کچھ کہا وہ ہم نے سن لیا اور سمجھ لیا۔

گویا کہ موقف میں کسی تبدیلی، رائے میں کسی ترمیم اور ارادے میں کسی طرح کی نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔۔اور پھر انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا:

قد سمعنا ما قلت، فتکلم یا رسول اللہ، فخذ لنفسک و لربک ما احببت(۱)

ہم نے سن لیا جو کچھ آپ نے کہا، یارسول اللہ آپ اپنے لیے اور اللہ کے لیے ہم سے جو چاہیں عہد لے لیں، ہم حاضر ہیں۔

یہ ان کا یقین محکم تھا، یہ ان صحابہ کا ایمان کامل تھا، خدائے واحد پر بھروسہ تھا جو انہیں اس قدر جرأت، ہمت اور شجاعت عطا کر رہا تھا کہ وہ ہر مصیبت اپنے سر لینے، ہر بلا سے نمٹنے اور ہر دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھے، اور کسی بڑے سے بڑے خطرے کے پیش نظر اپنے عزم اور اپنے ارادے کو تبدیل کرنے پر تیار نہ تھے، حال آں کہ تعداد میں تھوڑے تھے، افرادی قوت کی قلت تھی، لیکن عزم راسخ تھا۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں وعظ فرمایا، اللہ کا کلام سنایا، اسلام کا تعارف پیش کیا اور اپنی اطاعت کی تلقین اور اپنی اور صحابہ کی حفاظت وحمایت کی تاکید کی، یہ سن کر بھی بل کہ اپنا ارادہ انہوں نے نہیں بدلا، بل کہ پوچھا تو صرف اس قدر کہ ہمیں اس کا صلہ کیا ملے گا؟ یعنی مال وجان کی قربانی دینے کو تیار ہیں، ہاں اس کی جزا چاہتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی جزا بتائی جو یہ تھی کہ آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتیں۔ یہ سن کر انصار خوش ہو گئے، البتہ صرف ایک خدشہ ظاہر کیا، جو ان حالات میں بالکل جائز خدشہ تھا کہ آپ فتح وظفر کے بعد اس اپنے وطن میں تو نہ لوٹ آئیں گے؟ ہمیں چھوڑ تو نہ جائیں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کے لیے واضح طور پر فرما دیا:

بل الدم الدم، والهدم الهدم، انا منكم وانتم منی، احارب من حاربتم، واساجم من سالمتم

ہر گز نہیں، میرا جینا میرا مرنا تمہارے ساتھ ہے، تم میرے ہو میں تمہارا ہوں، جس سے تمہاری جنگ اس سے میری جنگ جس سے تمہاری صلح، اس سے میری صلح۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی یہ بات یوں سچی کر دکھائی کہ آج بھی مدینہ منورہ کی

۱۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۱۸۹

سرزمین آپ سے جدا نہیں، نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سرزمین سے الگ ہیں۔

صلی اللّٰہ علیہ وآلہ و اصحابہ صلاۃ و سلاماً دائماً متکرراً کثیراً کثیراً

یہ تھا اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان اور یقین محکم اور اپنے خالق و مالک پر یقین و اعتماد۔ نہ اسباب موافق، نہ حالات سازگار، نہ وسائل، نہ افرادی قوت، دنیاوی اعتبار سے دیکھا جائے تو کچھ بھی تو نہیں۔ مگر قوت ایمانی، جذبہ قربانی، اطاعت رسول اور دین اسلام سے وابستگی کا یہ عالم کہ ہر مشکل سے ٹکرا گئے، دشمن حملہ آور ہوا تو اس سے دو بدو مقابلے پر آمادہ، مگر کسی بات میں کسی مرحلے پر قدم پیچھے نہیں ہٹے، کسی مسئلے میں حق کے بارے میں تذبذب کا شکار نہیں ہوئے، نہ حق کی حمایت کے سامنے کسی طرح کی کوئی مصلحت سامنے آئی۔

اور ایک آج کے ہم مسلمان ہیں، تعداد میں ڈیڑھ ارب، وسائل میں دنیا کے ساٹھ سے ستر فیصد خام مال کے مالک۔ ذہانت میں کوئی ان کے پاسنگ بھی نہیں۔ محنت کے لیے دنیا آج بھی ان کی طرف دیکھتی ہے۔ معاملہ فہمی ان پر ختم ہے۔ جرأت و بہادری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ ان کی شجاعت ان کی محنت ان کی ذہانت اور ان کے وسائل غیر مسلموں کے لیے وقف ہیں۔ اور وقف بھی اس طرح سے کہ ان ہی کی رائے، ان ہی کا مشورہ، ان ہی کا تسلط، ان ہی کا حکم اور ہمارا کام صرف حکم کی بجا آوری۔

دیکھا جائے تو کمی صرف ایمان کامل اور یقین محکم کی ہے۔ کیا یہ دولت مسلمانوں کو دوبارہ مل سکتی ہے؟

امید کا دامن

ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے، اسلام لانا ایک بہت بڑی آزمائش بل کہ اپنی جانوں کو خطرات میں ڈال دینے کے مترادف تھا۔ مسلمان تھوڑے تھے، کم زور تھے اس لیے مجبور تھے اور مکمل طور پر مشرکین مکہ کے رحم و کرم پر تھے۔ مشرکین کے مظالم بڑھتے جا رہے تھے، اور مسلمانوں کے سامنے کوئی ایسی صورت نہ تھی جیسے اختیار کر کے وہ ان مشکلات سے چھٹکارا پا سکتے۔ ایسے میں نا امیدی کے جذبات اگر سر اٹھاتے تو قطعاً غیر متوقع نہ تھا، لیکن صحابہ کرام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے، اس لیے ان کے پایۂ ثبات کو استقلال حاصل رہا۔ البتہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انہوں نے اس خواہش کا ضرور کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے دعا فرمائیں، چناں چہ ایک موقع پر حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے جو ان چند صحابہ میں شامل تھے جن پر ظلم و تشدد اپنی بدترین حدوں سے بھی گزر چکا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

الا تستنصر لنا؟ الا تدعو الله لنا؟

آپ ہمارے لیے مدد کیوں طلب نہیں کرتے؟ ہمارے لیے اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا:

كان الرجل فيمن قبلكم يحفر له في الارض فيجعل فيه فيجاء بالمنشار فيوضع على راسه فيشق باثنين وما يصده ذلك عن دينه ويمشط بامشاط الحديد مادون لحمه من عظم او عصب وما يصده ذلك عن دينه والله ليتمن هذا الامر حتى يسير الراكب من صنعاء

الی حضر موت لایخاف الا اللہ او الذئب علی غنمه و لکنکم تستعجلون (۱)

ایمان لانے کے جرم میں گذشتہ امتوں کے افراد کے لیے گڑھا کھودا جاتا تھا، اور انہیں اس میں ڈال دیا جاتا تھا، پھر آروں کو سر پر رکھ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے۔ لیکن یہ سزا بھی انہیں ان کے دین سے نہیں روک سکتی تھی، اسی طرح لوہے کے کنگھے ان کے گوشت میں گھسا کر ان کی ہڈیوں اور پٹھوں پر پھیرے جاتے تھے، اور یہ سزا بھی انہیں اُن کے دین سے سے نہیں روک سکتی تھی۔ خدا کی قسم اسلام کا معاملہ اپنے کمال کو ضرور پہنچے گا، اور پھر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ ایک سوار مقام صنعا (یمن) سے حضر موت تک سفر کرے گا، مگر اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا، یا صرف بھیڑیوں کا خوف ہوگا کہ کہیں وہ اس کی بکریوں کو نہ کھا جائیں، البتہ تم لوگ عجلت سے کام لیتے ہو۔

ملاحظہ فرمایئے کہ کیا حالات ہیں؟ مسلمانوں کے کیا جذبات ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے میں بھی امید دلا رہے ہیں، انہیں مایوسی و ناامیدی کے اندھیروں سے امید و رجا کی روشنیوں کی طرف لا رہے ہیں، ان کی رہ نمائی عمل کے ان وسیع میدانوں کی جانب فرما رہے ہیں جہاں ناکامی کا گزر ہی نہیں، جہاں کام رانی و فتح مندی ہے، ہمیشہ کی فتح مندی، ہمیشہ کی کام رانی۔

ایسے وقت میں جب کہ مسلمانوں کو صبح کے بعد شام کے خیریت سے گذر جانے کا یقین نہ تھا اور شام خیریت و عافیت سے گذر جاتی تو صبح کے بارے میں فکر مندی کے سائے گہرے ہونے لگتے تھے، مسلمانوں کو مستقبل میں ایسی بڑی کام یابی، رفعت و سربلندی اور پوری دینا میں اسلام کی اشاعت کی خبر ایک پیغمبر ہی دے سکتا تھا، جس کا ہمہ وقت رابطہ اپنے رب سے ہو، اور جسے اپنی کام یابی پر صبح روشن سے زیادہ یقین کامل حاصل ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قدر یقین کامل اور پھر اپنے صحابہ کو اس قدر واضح اور دوٹوک انداز میں تسلی اور خوش خبری دینا یہ

۱۔ بخاری: ج ۳، ص ۱۳۲۲، رقم ۳۴۱۶

جائے خود ایک معجزے سے کم نہیں۔

آج ہم بھی بہت سی مشکلات سے دو چار ہیں، انفرادی سطح پر گھریلو پریشانیاں معاشی مشکلات، انفرادی الجھنیں سماجی مسائل اور طرح طرح کے مصائب ہمیں اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں، اور اجتماعی سطح پر بھی ہم محلے سے لے کر شہر تک اور شہر سے ملک اور ملکی سطح سے لے کر عالمی سطح تک انگنت مسائل اور بے شمار مصائب ہمارے سامنے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہیں، جن کی کثرت نے ہمیں پریشانی اور ذہنی الجھنوں سے دو چار کر رکھا ہے، یہاں تک تو بات درست ہے لیکن اس صورتِ حال کے نتیجے میں ہمارے اندر حالات کے سامنے سپر ڈال دینے اور مقابلہ کرنے کی بہ جائے شکست تسلیم کر لینے کی جو سوچ ابھر رہی ہے وہ خالص مایوسی کی پیداوار ہے۔ جب کہ اسلام تو ہر طرح کے حالات میں جدو جہد کی تلقین کرتا ہے اور مسلسل مقابلہ کرنے کا درس دیتا ہے، مذکورہ واقعے میں بھی یہی درس اور سبق پوشیدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ہماری چاروں جانب برائیاں براجمان ہیں، نیکیاں مٹ رہی ہیں اور برائیاں پروان چڑھ رہی ہے، بگاڑ اور فساد کے نیچے معاشرے کے ہر حصے پر گڑے ہوئے ہیں اور بدی کا راج تیزی سے پروان چڑھ رہے رہا، بد اخلاقی و بے راہ روی کی ہر سو حکمرانی ہے اور طرح طرح کی برائیاں ہم پر حاوی ہوتی جا رہی ہیں، لیکن اس سب کے باوجود مایوسی ہمارے ان مسائل کا حل تو نہیں، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ آخر ان برائیوں کے پروان چڑھنے میں خدانہ خواستہ کہیں ہمارا بھی تو ہاتھ نہیں؟ ہم بھی دانستہ یا نادانستہ ان برائیوں کے پھیلاؤ میں ممد و معاون تو ثابت نہیں ہو رہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تب بھی ہم نے ان برائیوں کے مقابلے میں نیکی کے کتنے دیے روشن کیے؟ اچھائی کے کتنے چراغ جلائے؟ اور بھلائی کی کتنی شمعوں کو حیات نو بخشی؟

ہماری مشکلات بہت ہوں گی، لیکن وہ وقت بھی ہمیں سامنے رکھنا چاہیے جب اللہ کے نبی، ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی اپنی سرزمین اور اللہ کا گھر حرم محترم تنگ کر دیا گیا، جن گلیوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بچپن اور لڑکپن سے لے کر ۵۰ قیمتی برس گزارے تھے ان ہی گلیوں سے آپ کو نکلنا پڑا۔ جذبات کا کیسا تلاطم ہوگا، تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم محترم اور اللہ کے گھر کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

واللہ انک لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الی اللہ ولولا انی اخرجت منک ماخرجت (۱)

اللہ کی قسم! تو مجھے بہت عزیز (پیارا) ہے، اگر میرے وطن کے لوگ مجھے مجبور نہ کرتے تو میں تجھے کبھی چھوڑ کر نہ جاتا۔

یہ موقع یقیناً ایسا تھا کہ مایوسیوں کو راہ ملتی اور ناامیدی کے اندیشے جنم لیتے، لیکن اس کے محض چند روز بعد جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی سفر میں ہی ہیں، اور منزل مقصود ابھی دور ہے، ایک شخص قریش کی جانب سے اعلان کردہ انعام حاصل کرنے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہیوں کے پیچھے آیا، اور خدا کی قدرت کہ جب آپ ﷺ سے محض چند قدم پر تھا تو اس کے قدم زمین نے پکڑ لئے، اور وہ زمین میں دھنس گیا۔ دوبارہ ایسا ہی ہوا تو اسے اپنی حقیقت اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا احساس ہوا۔ معافی کا خواست گار ہو کر وہ امان کا طالب ہوا۔ (۲) ایسے میں اسی شخص سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کے لیے زبان نبوت سے ارشاد ہوا:

کیف بک یا سراقة اذا تسورت بسواری کسری؟

اے سراقہ اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے شاہی کنگن پہنائے جائیں گے؟

یہ اتنی بڑی بات تھی اور اس وقت جو صورت حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو درپیش تھی اس کے تناظر میں یہ بات نہایت ہی غیر معمولی تھی، اس بنا پر حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے (یہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) پوچھا کہ کسریٰ بن ہرمز کے کنگن؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ چناں چہ آپ کی یہ پیش گوئی عہد فاروقی میں مدائن کی فتح کے موقع پر پوری ہوئی، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس مال غنیمت لایا گیا، جن میں کسریٰ کے یہ کنگن بھی شامل تھے تو انہوں نے سراقہ کو بلایا اور اس سے کہا:

۱۔ ترمذی: ج۵، ص۶۸۶، رقم ۳۹۵۱۔ ابن ماجہ: ج۴، ص۳۳۶، رقم ۳۱۰۸

۲۔ بخاری: ج۲، ص۲۲۸

ارفع یدیک والبسه السوارین

اپنے دونوں ہاتھ آگے کرو اور یہ کہہ کر اسے یہ دونوں کنگن پہنا دیے۔(۱)

درحقیقت امید و رجا کے یہی وہ روشن پہلو تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے سامنے لاتے رہے، اور ان کی قوت فکر و عمل ان سے توانائی حاصل کرتی رہی۔

یہ حالات ہمیں درس دے رہے ہیں کہ حالات خواہ کتنے ہیں ناسازگار ہوں، اور فضا کس قدر ہی مخالف کیوں نہ ہو، ہمیں عزم و یقین کے دامن کو تھام کر استقلال مزاج کے ساتھ کارزار حیات میں اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ مایوسی و ناامیدی کا تعلق تو مسلمان سے ہے ہی نہیں، یہ تو ان کی صفت ہے جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے، یا اس یقین سے محروم ہیں جو اسلام سکھاتا ہے، قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ہمیں بتایا گیا:

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ (۲)

اپنے رب کی رحمت سے تو فقط گم راہ لوگ ہی ناامید ہوتے ہیں۔

اسی لیے دوسرے مقام پر قرآن حکیم نے امید کا تعلق مومنین سے جوڑا اور بتایا کہ رحمت باری کی امید صرف مومن ہی رکھ سکتا ہے، فرمایا:

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ (۳)

اور تمہیں اللہ سے وہ امید ہے جو اِن (کافروں) کو نہیں۔

ہمیں بھی امیدوں کے چراغ فروزاں کرنے ہیں، مایوسی کے اندھیروں کو مسلسل شکست دینے کے لیے۔

۱۔ حلبی: ج ۲، ص ۲۲۱

۲۔ الحجر: ۵۶

۳۔ النسا: ۱۰۴

عزم واستقلال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم واستقلال بھی بے مثل و بے مثال ہے اور ہم سب کے لیے پیروی کا عملی نمونہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر دور میں ہر طرح سے آزمایا گیا اور یہ کوشش کی گئی کہ آپ اپنے مشن سے دست بردار ہو جائیں، لیکن آپ اپنے مشن پر عزم واستقلال کے ساتھ قائم رہے۔ پورے استقلال کے ساتھ نامساعد حالات میں ۲۳ برس گزارنا اور اس طرح گزارنا کہ ہر آنے والا سورج حیاتِ نو کی امیدیں اور پیغامِ حق کی اشاعت کی نویدیں لے کر طلوع ہو رہا ہو، کیا اور دیگر معجزات کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ نہیں ہے؟ حیات افزا اور زندگی افروز معجزہ، جس کا پیغام ہمارے لیے یہی ہے کہ ہم بھی اس پر عمل پیرا ہو کر زندگی کے ہر حصے کو کام یاب و کام ران بنا سکتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ایک غیر فلاحی معاشرے کو ایک مکمل انسانی اور اسلامی فلاحی معاشرے میں تبدیل کیا، جور و ستم میں ڈوبے ہوئے معاشرے کو عدل وانصاف سے روشناس کرایا اور اس راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو صبر واستقلال سے کام لیتے ہوئے عبور کیا، یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم واستقلال کا واضح اور کھلا ثبوت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت اپنی جدوجہد کا آغاز کیا، اس وقت آپ کے ہم راہ کوئی ایک شخص بھی نہیں تھا اور پھر کئی برس تک مسلسل جدوجہد اور تبلیغ کے باوجود آپ کی دعوت کو تسلیم کرنے والوں اور پیغامِ حق کو قبول کرنے والوں کی تعداد تیس چالیس سے زیادہ نہ ہو سکی، لیکن یہ بات آپ کے پایۂ استقلال میں ادنیٰ لغزش پیدا کرنے میں بھی کام یاب نہ ہو سکی۔

عزم واستقلال کی بنیاد درحقیقت انسان کے یقین پر ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خدائی مشن کی کام یابی کا اس درجہ یقین حاصل تھا کہ آپ جب تنہا تھے تب بھی اپنے کام

کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر طرح کے کامل عزم کے حامل تھے۔ آپ جب دشمنوں میں گھیر ہوئے تھے تب بھی آپ کا عزم اس طرح کامل تھا اور آپ پر جب فتوحات کا در وا ہو چکا تھا تب بھی آپ کا عزم وہی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزِ اول ہی کی مانند اپنے سفر پر گامزن تھے۔ کسی بھی مرحلے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد متزلزل نہ ہوا اور کسی بھی فیصلے کے لیے آپ کو سوچنا نہیں پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قدم واضح اور ہر اقدام روشن تھا، اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم وارادے کا ہی اعجاز تھا کہ جب بھی کسی نے آپ کے آہنی عزم واستقلال کے سامنے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور سب ہی مخالف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل آ کے شکست سے دوچار ہوتے چلے گئے، اور بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیش کردہ تصورات اور اسلامی تعلیمات پر مشتمل ایک کامیاب و مکمل معاشرہ عملی شکل میں تشکیل فرما دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم واستقلال کو ہر طرح سے آزمایا گیا، پہلے پہل تو کفار مکہ نے ڈرا اور دھمکا کر اپنا کام نکالنے کی کوشش کی، پھر ایذا رسانی، تشدد اور تکالیف کا سلسلہ شروع کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام اہل ایمان پر انہوں نے صرف خدائے واحد کو ماننے کے جرم میں زندگی کی راہ کٹھن کر دی، مگر جب یہ دونوں حربے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم راہ مسلمانوں نے اپنے عزم واستقلال سے ناکام بنا دیے تو قریش نے نئی چال چلی، اب انہوں نے لالچ کے راستے آپ کے عزم واستقلال کو چیلنج کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکومت و بادشاہت، مال و دولت اور حسن وعورت کی پیش کش کی، یہ مواقع بہادر سے بہادر انسان کے بھی پایۂ ثبات کو ڈگمگانے کے لیے کافی ہیں، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ دعوت بھی کوئی کشش نہیں رکھتی تھی اور دعوتِ حق کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان دنیاوی لذتوں کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس راہ سے بھی عزم واستقلال سے گزر گئے۔

جب قریش کو ہر طرح سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی جھنجھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست چچا ابو طالب کو اس قدر ڈرایا کہ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نرمی کا مشورہ دینے لگے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ جملہ ارشاد فرمایا جو عزم و

استقلال کی معراج کے حصول کے بغیر نہیں کہا جا سکتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا عم، واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی، والقمر فی یساری علی ان اترک ہذا الامر، حتی یظہرہ اللہ، او اہلک فیہ، ماترکتہ (۱)

اے چچا! اگر قریش میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں، تاکہ میں اپنی دعوت کا یہ عمل ترک کردوں، تب بھی میں حق کے اعلان سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا دین سب پر غالب آجائے یا میں اس راستے میں کام آجاؤں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ خود عملی طور پر عزم واستقلال کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش فرمایا، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی تلقین فرمائی، ایک مرتبہ مخالفین کی جانب سے مسلمانوں کو پہنچائی جانے والی تکالیف سے تنگ آکر بعض صحابہ کرام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قد کان من قبلکم یؤخذ الرجل فیحفر لہ فی الارض ثم یؤتی بالمنشار فیجعل علی رأسہ فیجعل فرقتین مایصرفہ ذالک عن دینہ، ویمشط بأمشاط الحدید مادون عظمہ من لحم وعصب مایصرفہ ذالک عن دینہ، واللہ لیتمن اللہ ہذا الامر حتی یسیر الراکب مابین صنعاء وحضرموت مایخاف الا اللہ والذئب علی غنمہ ولکنکم تعجلون (۲)

تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں ان کے جسموں پر آرے چلائے گئے اور ان کی کھالیں تک اتار لی گئیں، مگر وہ اپنے مذہب سے نہیں پھرے، خدا کی قسم، دین اسلام اپنے کمال کو پہنچ کر رہے گا، حتی کہ صنعاء سے حضرموت تک سفر کرنے والا مسافر خدا کے سوا اور اپنے ریوڑ کے لیے بھیڑیے کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا۔

۱۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۵۰۴

۲۔ ابوداؤد: ج ۲، ص ۳۹۶۔ رقم ۲۶۴۹

آج امت مسلمہ ایک بار پھر اپنی تاریخ کے شدید ترین بحران سے دو چار ہے، مشکلات، مصائب اور شدائد کی ایک قطار ہے جو اس پر مسلسل نازل ہو رہے ہیں اور ہر مصیبت پہلے سے زیادہ شدید نظر آتی ہے، لیکن قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو یہ مصائب ہلکے نظر آنے لگتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عزم وحوصلہ استقلال اور صبر وتحمل ہمیں نئے راستے بتاتا اور عزم وعمل کی نئی راہیں دکھاتا ہے۔

سیرت طیبہ کا مطالعہ ہمیں روشنیوں کے اس منبع کی جانب رہ نمائی کرتا ہے جہاں اندھیروں کا گزر ہی نہیں اور تاریکی کے جہاں پر جلنے لگتے ہیں۔

مشکلات ہمیشہ عارضی ہوتی ہیں خواہ کتنی ہی طویل مدت تک کیوں نہ جاری رہیں، اور پھر یہ تو عزم وارادے کو مہمیز کرنے کا کام دیتی ہیں، پھر یہ مشکلات تو آزمائش ہیں اور آزمائش اہل ایمان کے ساتھ لازم وملزوم ہیں، ایمان اور آزمائش کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ہمارا عزم پختہ، عمل مضبوط، راہ متعین اور منزل واضح ہونی چاہیے۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب خواہ کتنا ہی مستحکم ومضبوط نظر آتا ہو، فریب وقت کے سوا کچھ نہیں۔

خوفِ خدا

حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی خلیفہ ہیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اور ان کے درمیان کوئی سات خلفا ہوئے ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ان کی خدا ترسی، عدل، انصاف اور خالص اسلامی طرز حکم رانی کی وجہ سے عمر ثانی بھی کہا جاتا ہے اور صحابی نہ ہونے کے باوجود انہیں خلیفۂ راشد قرار دیا گیا ہے، ان کا دورِ حکومت بہت مختصر صرف ڈھائی برس رہا، لیکن اس قلیل عرصے کے باوجود ان کی نیک نامی اس قدر تھی کہ ان کی وفات پر صرف مسلمانوں نے ہی نہیں، غیر مسلموں نے بھی غم کا اظہار کیا اور ان کے کارناموں کا برملا اعتراف کیا۔

انہوں نے یہ مقام کس طرح حاصل کیا؟ اس راز سے ان کی اہلیہ نے ان کی وفات کے بعد پردہ اٹھایا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات کے بعد کچھ لوگ ان کی اہلیہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ان کے بارے میں کوئی خاص بات بتائیے انہوں نے فرمایا:

واللہ ما کان عمر باکثرکم صلاۃ ولا صیاماً، ولکنی مارأیت عبداللہ قط کان اشد خوفا اللہ من عمر

خدا کی قسم عمر رحمہ اللہ نماز روزے میں تم سے زیادہ نہیں تھے، مگر میں نے ایسا کوئی بندۂ خدا نہیں دیکھا، جو عمر سے زیادہ خوفِ خدا رکھتا ہو۔

یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کی کامیابی کا اصل راز یہ تھا کہ وہ خوفِ خدا میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بڑھے ہوئے تھے، یہی سبب تھا کہ ہر معاملے میں ان کا رویہ وہی ہوتا تھا، جس کا شریعت حکم کرتی تھی، چوں کہ خوفِ خدا ان پر ہر وقت طاری رہتا تھا اس لیے ذاتی خواہشات، نفسانی عوامل، داخلی دباؤ اور خارجی محرکات، کچھ بھی ان کے فیصلے اور اقدام کی راہ میں حائل

نہیں ہو سکتے تھے۔

دیکھا جائے تو سلطنتوں اور حکومتوں کے معاملات کے الجھانے، پراگندہ کرنے، ان میں انتشار و تضاد پیدا کرنے اور انہیں بالآخر تباہی کے دہانے تک پہنچا دینے میں ان ہی عوامل و اسباب و محرکات کا دخل ہوتا ہے، اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تلقین کی ہے، انہیں خوف خدا پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے اور طرح طرح کی مثالیں دے کر ترغیبات اور ترہیبات بیان کر کے انسان کو یہ بتایا کہ انسان بننے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کے قلوب واذہان میں خوف خدا جاگزیں ہو جائے۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عملی طور پر خوف خدا کو اپنے اسوۂ حسنہ کی صورت میں بھی پیش فرمایا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی وقت میں ایک پیغمبر کے ساتھ ساتھ حاکم وقت بھی تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر عمل ہر انسان کے ساتھ ساتھ حاکموں کے لیے بھی خصوصیت کے ساتھ راہ عمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر طاری رہتا تھا کہ آپ ہمہ وقت اس کے حضور میں عجز و نیاز اور کامل بندگی کی تصویر بنے رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر معاملے میں اپنی بندگی کا اظہار فرماتے، مثال کے طور پر کپڑے پہنتے تو فرماتے:

انما انا عبد البس کما یلبس العبد

میں تو ایک بندہ ہوں اور اسی طرح لباس پہنتا ہوں، جیسے بندے لباس پہنتے ہیں۔

کھانا کھاتے تو کہتے:

انا اکل کما یاکل العبد

میں بندوں کی طرح کھانا کھاتا ہوں۔

ایک دفعہ ایک شخص ملنے کے لیے آیا۔ اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ہون علیک، فانما انا ابن امرأة من قریش کانت تاکل القدید(۱)

۱۔ المستدرک: ج ۳، ص ۵۰۔ رقم ۴۳۶۶

گھبراؤ نہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔ جو سوکھا گوشت پکا کر کھاتی تھی۔

اس طرح کے جملوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درحقیقت اس امر کی جانب امت کی توجہ مبذول کرانا چاہتے تھے کہ یہ دنیا ایک نظام کے تحت چل رہی ہے اور اس کا کنٹرول خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے، وہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے، باقی ساری دنیا اس کی مخلوق ہے سارے انسان اس کے بندے ہیں اور اپنے ہر ہر عمل میں اس کے سامنے جواب دہ ہیں نیز مرنے کے بعد انسان کا سلسلہ حیات منقطع نہیں ہوتا، ہاں اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، صرف ایک محدود مدت کے لیے انسان پردۂ کائنات سے ہٹ جاتا ہے، اس وقفے کو اس مدت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جب طالب علم امتحان دینے کے بعد نتیجے کے منتظر ہوتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوف خدا لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنے کے لیے مختلف مواقع پر مختلف اسلوب سے تعلیم دیتے تھے۔ بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے، طلوع اسلام کے کوئی تین برس بعد حکم ہوا کہ دعوت اسلام کو عام کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفا کے مقام پر جو ایک بلند پہاڑ تھا اور جس کی باقیات اب بھی موجود ہیں اور حج وعمرے کے مناسک میں سعی کا آغاز اس سے ہوتا ہے، ایک خطبہ ارشاد فرمایا اس میں اہل مکہ کو ان الفاظ میں خوف خدا کی تعلیم دی فرمایا:

واللہ لتموتن کما تنامون و لتبعثن کما تستیقظون، ولتحاسبن بما تعملون و لتجزون بالاحسان احساناً وبالسوء سوءاً و انھا لجنۃ ابداً او النار ابداً(۱)

خدا کی قسم تمہیں مرنا ہے، جس طرح تم سوتے ہو اور پھر تم کو اٹھنا ہے، جس طرح تم جاگتے ہو اور ضرور تم سے حساب لیا جائے گا جو تم کرتے ہو اور پھر اچھے کام کا اچھا بدلہ ہے اور برے کا برا بدلہ ہے اور اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے باغ ہے یا ہمیشہ کے لیے آگ۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور ذاتی عمل ہمارے لیے اس معاملے میں بھی راہ عمل اور

۱۔ السیرۃ الحلبیہ: ج ۱، ص ۴۵۹

بہترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کے مقام و مرتبے پر غور کیجیے آپ کی عظمت شان کا تصور کیجیے اور اس کے ساتھ ایک حاکم ریاست کے طور پر آپ ﷺ کو جو وسیع اختیارات حاصل تھے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صورت میں جو مضبوط افرادی قوت حاصل تھی اس کو دیکھیے پھر آپ ﷺ کی عاجزی و اظہار بندگی کی اہمیت زیادہ واضح ہو کر سامنے آئے گی۔

آج پوری دنیا کا یہ عالم ہے کہ جس کسی کو بھی جس قدر بھی قوت حاصل ہو جاتی ہے، جس قدر اختیارات کا مالک ہو جاتا ہے، وہ اسی قدر الا ماشاء اللہ اپنے دائرۂ اختیار میں جبر و ستم کا نشان بن جاتا ہے، اس میں کسی طرح کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ درحقیقت اس بنا پر ہوتا ہے کہ ہمارے ذہنوں سے وقتی اختیارات کے نشے میں یہ بات اوجھل ہو جاتی ہے کہ ہمارے جو بھی اختیارات ہیں وہ عارضی ہیں، پھر خود ہم بھی فانی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم سے اوپر بھی کوئی قوت فائنل اتھارٹی کی حیثیت سے موجود ہے، جس کے سامنے صرف ہم نے ہی نہیں ہر ایک نے جواب دہی کرنی ہے۔

اور ہماری حیثیت کیا؟ ہم سے کہیں زیادہ اختیار، قدرت، قوت اور طاقت رکھنے والے بڑے بڑے جابر، اپنے اپنے دور کے بڑے بڑے فرعون، شداد اور نمرود جب ان کی مدت پوری ہوئی تو ان کی کچھ یوں کایا پلٹ ہوئی کہ ماضی کے قصے اور فسانے سے زیادہ ان کی حقیقت نہ رہی اور آج انہیں یاد بھی کیا جاتا ہے تو صرف کسی برے کردار کی مثال کے طور پر، ان کو سراہنے اور ان کے کردار کو ستائش کی نظر سے دیکھنے والا آج اتنی بھری پری دنیا میں کوئی ایک بھی موجود نہیں۔

اس ساری گفت گو میں ایک اور نکتہ بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ طاقت اور مادی قوت ہی اصل طاقت نہیں بل کہ انسان کی اصل طاقت اس کی یہ صفت خوف خدا ہے۔

اعمال کی افادیت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روز قیامت کو اللہ کے دربار میں ہونے والے حساب کتاب کی منظر کشی فرمائی، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

روزِ قیامت جب اللہ تعالیٰ کا دربار آراستہ ہوگا اور انصاف کا آغاز ہوگا، تو سب سے پہلے ان لوگوں کو پیش کرنے کا حکم ہوگا، جو قرآن حکیم کے عالم تھے، پھر وہ پیش ہوں گے جو جہاد میں مارے گئے تھے، پھر اہل دولت و ثروت پیش ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ عالم سے سوال کرے گا کہ کیا میں نے تمھیں وہ سب کچھ نہیں سکھایا، جو میں نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا؟ تو تم نے اس پر کس قدر عمل کیا؟ وہ عرض کرنے گا کہ اے اللہ، میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، اللہ تعالیٰ کہے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو یہ سب اس لیے کرتا تھا کہ لوگ کہیں کہ یہ بڑا عالم ہے، تو دنیا میں تجھے یہ سب کچھ کہا جا چکا ہے۔ (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا ہے) پھر دولت مند سے اللہ فرمائے گا کہ کیا میں نے تیرے لیے دنیا کو کشادہ نہیں کر دیا تھا؟ یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہیں رہا، وہ عرض کرے گا کہ کیوں نہیں اے میرے رب، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ میں نے تجھے جو کچھ دیا اس کا تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں حق داروں کو ان کا حق دیا کرتا تھا اور خیرات کیا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹا ہے، پھر ارشاد باری تعالیٰ ہوگا کہ تو یہ سب اس لیے کرتا تھا وہ لوگ تجھے بڑا سخی کہیں، تو یہ سب تجھے دنیا میں کہا جا چکا (یعنی تو بھی دنیا میں بدلہ پا چکا، اب آخرت میں تیرا کوئی حصہ نہیں) اس کے بعد جہاد میں شہید ہونے

والے شخص کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو کس بات کی خاطر مارا گیا؟ وہ کہے گا کہ تیرے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میں لڑا یہاں تک کہ تیری راہ میں میں شہید ہو گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، تو دنیا میں تجھے یہ سب کہا جا چکا (تو بھی اپنا بدلہ دنیا مین پا چکا) پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جہنم میں ڈالے جائیں گے۔(۱)

اس تفصیلی روایت اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک سے ہمیں بنیادی سبق یہ ملتا ہے کہ اعمال کی افادیت رضائے الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، اعمال دیکھنے میں خواہ کتنے ہی خوش نما کیوں نہ ہوں، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر نہیں کیے جا رہے ہیں، تو وہ نہ صرف بے روح ہیں بل کہ ان کی افادیت بھی سامنے نہیں آسکتی۔ دنیاوی اعتبار سے اگر اس سے وقتی طور پر کچھ فوائد حاصل ہو جائیں تو اور بات ہے، دائمی اور اخروی فوائد کی امید رکھنا ایسی صورت میں کارِ عبث ہے، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اگر ہم ان لمحاتی، محدود اور وقتی فوائد پر ہی قناعت و اکتفا کر جائیں تو ہمارا ایمان کیوں کر کامل ہو سکتا ہے؟

اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اعمال کی فادیت کا تعلق نیت سے ہے، اور نیت دل کا وظیفہ ہے، جس سے صرف خالق کائنات ہی واقف ہو سکتا ہے، کسی اور پر اس کا راز ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس باب میں کسی قسم کی چالاکی اور عیاری کام نہیں آسکتی، کام جس ذات کے لیے کیا جا رہا ہے، اس پر سب عیاں ہے، اسے سب کچھ معلوم ہے، ایسے میں محض دکھلاوے کے لیے یا کسی دنیاوی غرض سے کوئی کام سرانجام دینا کیسے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے؟

رضائے الٰہی کا حصول اور اس کی نیت دراصل ایک اور حقیقت کی ترجمانی ہے، اور وہ مافوق الاسباب ہستی کے ساتھ انسان کی وابستگی ہے، اسلامی تصور یہ ہے کہ تمام اعمال کا حسن و قبیح اللہ تعالیٰ کے حوالے سے متعین ہوتا ہے، حسن خلق جو دنیا و آخرت میں موثر ہے، وہی ہے جس کی اساس اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس اساس کے بغیر کسی عمل کا حسن قابل قبول نہیں ہے، یہی

۱۔ ترمذی: ج۴، ص ۱۶۹، رقم ۲۳۸۵

وجہ ہے کہ دنیوی مسرت وانبساط کو ایک حد تک تسلیم کرتے ہوئے، اسلام حقیقی غرض وغایت رضائے الٰہی کو ہی قرار دیتا ہے۔(۱)

ایک حدیث میں رسول اکرم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا سائتک سیئتک و سر تک حسنتک فانت مو من (۲)

جب تمہاری نیکی تمہیں مسرت سے سرشار کرے، اور تمہاری برائی تمہیں برائی محسوس ہو تو تم مومن ہو۔

یہاں نیکی پر طبعی مسرت وسرشاری اور بدی پر طبعی انقباض اور غم کی کیفیت کو ایمان کی پہچان قرار دیا گیا ہے، یہ ان لوگوں کے لیے ہے، جو دل و دماغ دونوں اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو قبول کرتے ہیں، جن کا توحید باری تعالیٰ پر یقین کامل ہے، اور جو احکاماتِ اسلام پر پورے یقین واعتماد کے ساتھ عمل کرتے ہیں، اور وہ تشکیک وتذبذب کا شکار نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے اگر کوئی شخص کسی نفسیاتی کمزوری کے سبب کسی برائی میں اپنی تسکین دیکھتا ہے یا کسی بدی سے سرور حاصل کرتا ہے تو وہ نہ تو دلیل بن سکتا ہے نہ اس کی یہ کیفیت اس فعل کے درست یا مبنی برحق ہونے کی ضمانت ہے۔

اس موقع پر یہ بات مکمل وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ تمام نیکیوں کی بنیاد رضائے الٰہی کا حصول ہے، یہ وہ مطلوب کیفیت ہے جس کے بغیر بڑی سے بڑی عبادت اور وقیع سے وقیع نیکی بھی عبث و بے فائدہ ٹھہرتی ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہر کام کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اس کا ظاہری پہلو ہے، جس کے مطابق کوئی نیک کام اگر اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے گا تو وہ عنداللہ مقبول ہوگا اور اگر وہ محض دنیاوی اغراض کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا تو آخرت میں اس کے لیے کچھ حصہ نہیں ہوگا، ایک اس کا باطنی پہلو بھی ہوتا ہے، اس صورت میں جب کوئی کام اللہ کی رضا کے نیک اور پاکیزہ جذبے سے سرانجام دیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت پیدا فرما دے

۱۔ ڈاکٹر خالد علوی۔ خلق عظیم: ص ۳۵

۲۔ احمد: ج ۶ ص ۳۳۴۔ رقم ۲۱۶۵۵

گا، اور اس کے اثرات معاشرے پر نمایاں ہوں گے بہ صورت دیگر اس کے مقاصد دنیاوی ہوں گے تو وہ نیک کام خواہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنا ہی بڑا اور وقیع کیوں نہ ہو، اپنی حقیقت کے لحاظ سے کچھ وزن نہیں رکھے گا، اس کے نہ تو معاشرے پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے، نہ اس کام میں برکت پیدا ہوگی، نہ اس کام میں کچھ ترقی ہوگی۔ ہماری تحریر، تقریر، دینی اجتماعات، لٹریچر سب اسی ذیل میں آتے ہیں۔

آج وسائل پہلے سے کس قدر زیادہ ہیں؟ ہر چیز کی فراوانی ہے، خصوصاً دینی لٹریچر کی ایک بہتات ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے مثبت اثرات معاشرے پر پڑ رہے ہیں؟ جواب اگر مکمل طور پر نفی میں نہ بھی ہو، تب بھی کسی حد تک نفی میں ضرور ہوگا، اس کا سبب یہی ہے کہ کہیں لکھنے والے کی نیت خالص نہیں، کہیں چھاپنے والے دوسرے مقاصد کو فوقیت دے رہے ہیں، کہیں بیچنے والوں کی نیت کے کمزور پہلو اس نیک عمل پر اثر انداز ہو رہے ہیں، تو کہیں خریدنے اور پڑھنے والے اپنی نیت کے منفی پہلوؤں کی زد میں آ رہے ہیں، اس پر ہماری زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی مساعی کا از سر نو جائزہ لیں، اور خصوصاً نیتوں کا احتساب کریں، اور یہ دیکھیں کہ یہ سب کچھ جو ہم کر رہے ہیں یہ آخر کیوں کر رہے ہیں؟ خصوصیت کے ساتھ وہ تمام لوگ جو کسی نہ کسی حیثیت سے دین کے کسی بھی شعبے سے وابستہ ہیں۔ ان کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور جو لوگ صرف تن خواہ کی خاطر کام کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ کسی ایسے میدان میں انتخاب کریں، جس پر خدمت دین کا شبہ نہ کیا جا سکے، تاکہ کم از کم ہماری نیتوں کے کم زور پہلو اور ان کے اثرات ہم تک ہی محدود رہیں، وہ متعدی ہو کر پورے معاشرے میں نہیں پھیلیں۔

اللہ تعالیٰ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں، سب ہی کو اخلاصِ نیت و عمل کی دولت سے سرفراز فرمائے، آمین۔

مداومت عمل

اعمال اور عبادات کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات فرماتے تھے ان میں مداومت اور اعتدال سرفہرست ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بھی اسی پر تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

ان احب الاعمال الی اللہ ادومہا وان قل (۱)

اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے، خواہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں

وکان اذا عمل عملاً أثبۃ (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے۔

اس طرح ان دونوں روایتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور قول دونوں ہی سامنے آجاتے ہیں اور ان دونوں روایتوں کو سامنے رکھنے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ مداومت عمل اور اعمال پر ہمیشگی کرنے اور پوری پابندی سے ان پر عمل پیرا ہونے کی تاکید دین میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ دوسرے یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل دونوں ایک دوسرے کی تاکید، توضیح اور تشریح کرتے تھے، دونوں میں کامل اتحاد تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات دوسروں کو فرماتے تھے، آپ خود بھی اسی پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

۱۔ احمد: ج ۷، ص ۳۸۱

۲۔ بخاری: کتاب اللباس، باب الجلوس علی الحصیر

مداومت عمل کے سلسلے میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلے میں جو تعلیمات ہیں ان کا منشا، مقصد اور فوائد کیا ہیں؟ ان پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا ذیل کا واقعہ تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان سے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ اطلاع صحیح ہے کہ تم دن بھر روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فلا تفعل صم وأفطر وقم ونم، فان لجسدک علیک حقا وان لعینک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا وان لزورک علیک حقا، وان بحسبک ان تصوم کل شهر ثلاثة ایام فان لک بکل حسنة عشر امثالها

ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو (یعنی مسلسل روزے رکھنے کی بجائے درمیان میں وقفہ کیا کرو) نماز بھی پڑھو اور سویا بھی کرو، کیوں کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تم سے ملاقات کرنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ ہر ماہ تین روزے رکھ لیا کرو، کیوں کہ تمہیں ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ملے گا اور اس طرح تمہاری ساری عمر روزہ شمار ہوگا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لیکن میں نے اپنے اوپر سختی چاہی سو مجھ پر سختی کردی گئی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اپنے اندر اس سے زیادہ کی قوت پاتا ہوں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام والا روزہ رکھا کرو اور اس سے آگے نہ بڑھو۔ میں نے پوچھا کہ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ کس نوعیت کا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ اسی طرح دوسری روایت میں یہ اضافہ بھی منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ماہ میں ایک بار قرآن مجید ختم کیا کرو، مگر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ

نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا پھر تین روز میں ایک قرآن ختم کیا کرو۔ راوی کہتا ہے کہ جب عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ضعیف ہوگئے تو فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رخصت کو مان لیا ہوتا۔ (۱)

یعنی بڑھاپے میں اب ان معمولات کو پورا کرنا مشکل ہے، جن پر جوانی کے زمانے میں بہ سہولت عمل ہو جاتا تھا، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات کے اس معمول پر تخفیف کی جو ہدایت کی تھی اس کا سبب بھی یہی تھا، اور اس سے بھی مداومت عمل کی اہمیت اور ضرورت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

اعمال پر مواظبت اور مداومت سے ان میں برکت ہوتی ہے اور یہ اعمال محض اعمال نہیں رہتے بل کہ وہ ایک روایت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس صورت میں ان اعمال میں ایک تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی برکت یہ ہوتی ہے کہ کم وقت میں زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جب ان اعمال کو شمار کیا جائے تو بعض اوقات انسان خود حیران رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہ کام اس کے ہاتھوں انجام پایا ہے؟ یہی وہ پہلو ہے جس کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو متوجہ فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت آغاز کی سطور میں پیش کی جا چکی ہے، ایک اور روایت میں آتا ہے کہ حضرت علقمہ نے ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کوئی عمل کسی خاص روز کرتے تھے؟ یا کچھ اعمال ایام کے ساتھ مخصوص فرما رکھے تھے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

لا! كان عمله ديمة وأيكم يستطيع ما كان النبى صلى الله عليه وسلم يستطيع (۲)

نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو مسلسل ہوتا تھا، پھر فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ

۱۔ بخاری: کتاب الصیام، باب حق الجسم فی الصیام

۲۔ بخاری: رقم ۱۹۸۷

وسلم جو کچھ کر سکتے تھے، اس کی تم میں سے کون طاقت رکھتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک درخشاں پہلو مداومت عمل ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی جو بھی عمل ایک بار اختیار فرمایا تو پھر ہمیشہ اس پر کاربند اور قائم رہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت مبارکہ ہر طرح کے معاملات میں تھی، جن میں عبادات بھی شامل ہیں اور روزمرہ کے معاملات اور معاشرتی امور بھی۔ عبادات کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول مبارک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ رات کو عبادت کیا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ہمیشہ جاری رہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

> آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کی عبادت کو بھی ترک نہیں کیا، اگر کبھی ایسا ہوا کہ طبیعت ناساز ہوئی تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوافل بیٹھ کر ادا فرمائے۔(۱)

اسلامی تعلیمات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام میں اعتدال اور مداومت عمل دونوں کی ہدایت کی گئی ہے اور مداومت عمل وہ راستہ ہے جو اعتدال کی منزل پر منتج ہوتا ہے اور اعتدال اسلام کی نظر میں ہر معاملے میں پسندیدہ ہے۔

کسی بھی کام کی ایک ترتیب ہے، مسلسل ایک معمول کے طور پر نیک نیت کے ساتھ کرنے سے انسان کے مزاج میں توازن بھی پیدا ہوتا ہے اور اس میں استقامت جیسی مفید اور مطلوب صفت بھی پروان چڑھتی ہے، یہ مداومت عمل کی ایک اضافی خوبی ہے، اس لیے مداومت عمل جہاں اس بنا پر ہماری لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اس کی تاکید کرتا ہے، وہیں ایک اچھا انسان بننے کے لیے بھی یہ صفت نہایت ضروری ہے۔ سو جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ کامیاب اور اچھے انسان کے روپ میں سامنے آئے، اس کے لیے اس آسمانی ہدایت اور نبوی تاکید پر عمل پیرا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

۱۔ ابوداؤد: ابواب قیام اللیل

کوئی نیکی چھوٹی نہیں

نعمان بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

الحلال بین و الحرام بین و بین ذالک امور مشتبہات، لا یدری کثیر من الناس امن الحلال ہی ام من الحرام؟ فمن ترکہا استبراء لدینہ و عرضہ فقد سلم، و من واقع شیئاً منہا، یوشک ان یوقع الحرام، کما انہ من یرعی حول الحمی، یوشک ان یواقعہ، الا وان لکل ملک حمیٰ، الا وان حمی اللہ محارمہ (۱)

حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی، اور ان دونوں کے مابین کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، اکثر لوگ اس سے واقف نہیں کہ وہ حلال ہیں یا حرام ہیں؟ سو جو کوئی اپنے دین اور عزت کو بچاتے ہوئے ان کو چھوڑ دے، وہ سلامت رہے گا اور جو ان میں سے کسی ایک چیز میں بھی مبتلا ہو گیا اس کے بارے میں خطرہ ہے کہ کہیں وہ حرام میں ہی مبتلا ہی نہ ہو جائے۔ جیسا کہ کوئی چرواہا کسی چراگاہ کے آس پاس اپنے جانوروں کو چرا رہا ہو تو خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ اس چراگاہ میں داخل ہی نہ ہو جائیں، آگاہ ہو جاؤ کہ ہر بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ (خاص حدود) ہوتی ہے۔ (جس میں دوسروں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے، اور اللہ کی مخصوص چراگاہ اس کے محارم (حرام کردہ چیزیں) ہیں۔

اس حدیث مبارکہ سے دو باتیں بہت وضاحت سے معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ ترمذی: ج ۳، ص ۳۔ رقم ۱۲۰۹

۱۔ حلال امور اور حرام امور کے مابین اگر شک پیدا ہو جائے تو اس تردد کے موقع پر حکم یہ ہے انسان حرام پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے اس کو ترک کر دے، تاکہ حرام سے بچ سکے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ کسی گناہ کو کم نہ جانے اور کوشش کرے کہ چھوٹے سے چھوٹے گناہ سے بھی محفوظ رہے۔

ایک عام انسانی نفسیات ہے کہ نیکی کا معاملہ ہو یا گناہ کا، بہت سی چیزیں ہم نے خود ہی متعین کر لی ہیں، اور اس کے مطابق اپنے لیے گنجائش پیدا کر لیتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ برائی کم درجے کی ہے اس لیے اسے کیا جا سکتا ہے اور یہ نیکی کم تر ہے اس لیے اسے ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں، حال آں کہ یہ بات قرآن و حدیث، مشاہدے اور نیکی اور بدی کے فلسفے کی رو سے بدیہی اعتبار سے غلط ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی نیکی نہ تو فی نفسہ نیکی ہے، نہ کوئی بدی فی نفسہ بدی ہے، ان امور کے سوا جو ہر ماحول، ہر معاشرے ہر مذہب اور دنیا میں رائج ہر اخلاقی فلسفے کی رو سے نیکی یا بدی شمار ہوتے ہیں۔ اصل میں اس کی نسبت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہے اور اسی اعتبار سے کسی کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے، اگر اللہ نے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کام کے کرنے کا حکم یا ترغیب دی ہے تو وہ نیکی ہے، اچھائی ہے، اسے کرنے سے ثواب بھی ہوگا اور انسان کو خود بھی فائدہ پہنچے گا اور اگر کسی کام سے منع کیا گیا ہے یا اس کی مذمت کی گئی ہے تو وہ کام درست نہیں، اس کے کرنے میں دنیاوی نقصان بھی ہے اور آخرت کا گناہ بھی۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کسی نیکی کو چھوٹی یا کسی برائی کو کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا، جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما دیں یا اپنے عمل سے اس کی ترغیب دیں، اور کوئی چیز کر کے امت کو دکھا دیں تو پھر اس کے بارے میں عقل اور نقل ایک ہی حکم دیتی ہے کہ اسے کرنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کی درجہ بندی، بات کو سمجھنے، اس کو واضح کرنے، سیکھنے سکھانے اور سہولت اور تعبیر و تشریح کی نیت سے تو کی جا سکتی ہے، لیکن اس درجہ بندی کا مقصد ان امور سے چھٹکارا اور میدان عمل سے فرار نہیں ہو سکتا۔

جب ہم کسی کام کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے، یا مسنون ہے، پھر یہ سنت

مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ تو کیا اس کے بارے میں یہ صراحت ہمیں حدیث میں ملتی ہے؟ یا وحی کی صورت میں ہماری سامنے موجود ہے؟ جب ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے تو پھر اس درجہ بندی کو قرآن وسنت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، یہی حال ممنوعہ امور کا ہے، کسی امر کے بارے میں مکروہ کہا جاتا ہے، کسی پر حرمت کا حکم لگایا جاتا ہے، پھر کسی کو مکروہ تنزیہی کہا جاتا ہے اور اور کسی کو مکروہ تحریمی، یہ درجہ بندی درست ہے، مگر مسائل کی تفہیم کی غرض سے ہے۔ اب اگر اس تفصیل کو دیکھ کر ہم اپنے لیے یہ گنجائش تلاش کریں کہ فلاں چیز کا گناہ چوں کہ کم ہے اس لیے اسے کیا جاسکتا ہے، تو یہ ضرور سوچنا ہوگا کہ اس کام سے کسی اور نے نہیں خود رسول خدا ﷺ نے منع فرمایا ہے، کیا آپ ﷺ کی ممانعت اس نوعیت کی ہے کہ اس سے اعراض کیا جاسکے، یا آپ ﷺ کی ترغیب اس حیثیت کی ہے کہ اس سے روگردانی ہوسکے؟

درحقیقت کسی بھی نیکی اور برائی کا بڑا چھوٹا ہونا آپس میں اضافت کے اعتبار سے ہے، تین مختلف عمروں کے بچوں میں سے درمیان والا بچہ اپنے بڑے سے اگر چھوٹا ہے تو اپنے چھوٹے بچے سے بڑا بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی نیکی زیادہ درجے کی نیکی سے کم تر محسوس ہوتی ہے تو کسی نیکی سے برتر بھی ہوگی اور یہی معاملہ گناہ کا بھی ہے، اور پھر جس مذہب میں راہ چلتے ہوئے راستے سے کانٹا اٹھا دینا بھی صدقہ ہو، اس میں کسی نیکی کو کم تر کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور جس مذہب میں محض پیاسے کتے کو ایک بار، صرف پوری زندگی میں ایک بار پانی پلا دینے پر بخشش ہوسکتی ہو، وہاں کسی نیکی کے کم تر ہونے کا حکم کوئی انسان کیسے لگا سکتا ہے؟

ہمارے ہاں جہاں ایک طرف اسلام کے ظاہری مظاہر ہی کو سب کچھ قرار دے کر معاملات اور حقوق العباد کی جانب سے سخت غفلت کا مزاج پایا جاتا ہے، وہیں دوسری جانب ظاہری مظاہر اور بہت سے اہم دینی واسلامی احکامات اور ان کی جزئیات وفروعات کو اپنے فہم اور ذہن کے مطابق کم تر خیال کیا جاتا ہے، جس کے سبب اس جانب سے غفلت عام ہے۔ طرح طرح کے دلائل دونوں کے پاس ہوں گے، لیکن اسلام کی عادلانہ ومعتدلانہ تعلیمات کی روشنی میں دونوں طریقے ہی افراط وتفریط کا شکار نظر آتے ہیں۔ صرف ڈاڑھی رکھ لینا ہی اسلام نہیں، لیکن ڈاڑھی کے بغیر بھی اسلام تکمیل نہیں پاسکتا، نماز وروزے کی پابندی ہی سب کچھ نہیں، لیکن اس کے بغیر حقوق العباد کی کیسی بھی بجا آوری ایمان کی تکمیل کا باعث نہیں بن سکتی۔

نماز وروزے کے ساتھ ساتھ جیسے دوسرے تمام معاملات، اخلاقیات، معاشرت ومعیشت میں اسلامی تعلیمات کی پابندی ضروری ہے اور نماز روزے کی تکمیل دیگر امور سے بری الذمہ نہیں کرسکتی، بعینہ اسی طرح بلند سے بلند اخلاق کا حامل ہونا بھی نماز روزے کا بدل نہیں بن سکتا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ چیزیں لوگوں کی نظر میں جلد آجاتی ہیں، اور کچھ کے بارے میں عامۃ الناس کو علم نہیں ہو پاتا، ایسے موقع پر جہاں نیکی چھپانے کی تاکید ہے اور ریاکاری کی حدود میں داخل ہونے والے امور سے بچنے کا حکم ہے، وہیں گناہوں سے بچنے اور لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے والے اور انہیں بدگمانی کا شکار کرنے والے امور سے بھی احتراز کا حکم ہے۔ جیسے وہ خدا کا حکم ہے ویسے ہی یہ بھی خدا کا حکم ہے، جس طرح اس حکم میں ترمیم وتنسیخ اور اس کی خلافِ منشا تشریح کا ہمیں کوئی حق حاصل نہیں، اسی طرح یہ حکم بھی ہمارے لیے صرف اس لیے ہے کہ ہم اس سے اپنے آپ کو بچالیں، نہ کہ قانونی موشگافیوں کے پلیٹ فارم پر اسے سجا کر مشقِ ستم بنا دیا جائے۔

آخر میں ایک بات اور، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی بات کا ثبوت احادیث کے ذریعے تو ہے ہی، جو احادیث کے مجموعوں میں محفوظ اور محدثین کی مساعی سے آج ہمارے درمیان موجود ہیں، مگر تعامل امت خود ایک بہت بڑی دلیل ہے، شرعی بھی اور عقلی بھی کہ کسی امر پر پوری قوم کا برس ہا برس سے عملی اتفاق خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ درست ہے، صحیح ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آج تک، ہم تک پہنچنے تک اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوئی، یہ پوری طرح خالص ہے۔

دین کی حدود

کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا، آپ کے اصحاب نے اس کی محنت اور سرگرمی کو دیکھا، تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ، کاش اس کی یہ محنت اور سرگرمی اللہ کے راستے میں ہوتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا:

ان کان خرج یسعی علی ولده صغاراً فهو فی سبیل الله، وان کان خرج یسعی علی ابوین شیخین کبیرین فهو فی سبیل الله، وان کان یسعی علی نفسه یعفها فهو فی سبیل الله، وان کان خرج ریاء و مفاخرة فهو فی سبیل الشیطان (۱)

اگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو اس کا یہ عمل اللہ کے راستے میں ہے، اور اگر وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے تو اس کا یہ عمل بھی اللہ کے راستے میں ہے، اور اگر وہ اپنی باعزت روزی کے لیے محنت کر رہا ہے تو اس کا یہ عمل بھی اللہ کے راستے میں ہے، اس کے برعکس اگر اس کی دوڑ دھوپ دکھاوے اور فخر کے لیے ہے تو اس کا یہ سارا عمل شیطان کے راستے میں ہے۔

ہمارا عجیب مزاج ہے، اسلام کے مزاج کے بالکل برخلاف کہ ہم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں دوہرے رویے اپنا رکھے ہیں، ایک شخص جو حقوق اللہ کے بارے

۱۔ طبرانی۔ المعجم الکبیر: ج ۱۹، ص ۱۲۹

میں بہت سرگرم ہو اور عبادات میں نہایت خشوع و خضوع، دل جمعی، احساس ذمے داری اور پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف ہو، اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حقوق العباد کے سلسلے میں بھی اس قدر سرگرم ہوگا، وہ معاملات اور اخلاقیات کے عام معیار پر بھی اتنا ہی پورا اترتا ہوگا۔

اس کا سبب واضح ہے، ہماری نظر میں نماز پڑھنے پر تو ثواب ملے گا، بل کہ یہ امر ہماری بخشش کا باعث ہے، روزے رکھنے میں بھی ثواب کا یقین ہے، لیکن اپنے معاملات دیانت و امانت سے ادا کرنے پر ہمیں اجر و ثواب کا یقین نہیں ہے، بندوں کے حقوق ادا کرنے پر ہمیں اس امر کا خیال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب بھی ہمیں نواز سکتے ہیں، اور یہ امر بھی روز قیامت ہماری بخشش کا سبب بن سکتا ہے، یا یہ کہ ان امور میں اپنی ذمے داریاں صحیح انداز میں ادا نہ کرنے پر ہم سے روز قیامت باز پرس ہوگی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی یہ تقسیم ہماری خود ساختہ ہے، اور اس پر عمل کے پیمانے بھی ہمارے اپنے ہی تراشے ہوئے ہیں، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس واقعے میں ہمارے لیے یہی درس پوشیدہ ہے، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول مبارک میں یہ بات واضح فرمادی کہ اگر کوئی شخص حالات ایمان میں حقوق اللہ کی نگہبانی کرتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے لیے رزق یا روزی کا بندوبست کرتا ہے، اور فکر معاش میں سرگرداں رہتا ہے تو یہ بھی دین کا ہی حصہ ہے، اس لیے کہ اسلام نے ہی اس پر یہ ذمے داری عائد کی ہے کہ وہ اپنے متعلق اور اہل و عیال کی پرورش کرے، ان کے نان و نفقے کا بندوبست کرے اور ان کی ضرورتوں اور صحت وغیرہ کا خیال رکھے، سو جو شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے رب کے احکامات کی بجا آوری میں مصروف ہے، وہ اپنے فرائض پورے کرنے میں مشغول ہے، اس لیے وہ اجر و ثواب کا مستحق ہے، اور یہ امر اس کی بخشش کا سبب بھی ہے، آخر کو یہ حکم بھی تو اسی رب کا دیا ہوا ہے، جس نے ہمیں نماز پڑھنے، روزے رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے حکم دیا ہے، پھر ان احکامات کی نوعیت میں ہم اپنی جانب سے تفریق کیسے کرسکتے ہیں۔

اس طرح ایک شخص اپنے والدین کی خدمت میں مصروف ہے، اس کی زیادہ تگ و دو ان کی ضرورتوں کی تکمیل اور ان کو راحت و اکرام پہنچانے کے لیے ہے، کیا اس کا مقام اس

شخص سے کم قرار پائے گا جو اضافی اوقات کو نفلی عبادت میں صرف کرتا ہو؟ اور اگر یہ شخص والدین کی دیکھ بھال چھوڑ کر اور ان کی خدمت کا فریضہ ترک کرتے ہوئے نفلی عبادات میں پوری تن دہی سے سرگرم ہو جائے تو کیا اسے حق بہ جانب قرار دیا جائے گا؟ اور قرآن وسنت کی روشنی میں اسے گناہ گار قرار نہیں دیا جائے گا؟

یقیناً وہ اپنے فرائض کو چھوڑنے والا اور اپنی ذمے داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے والا ہے، اس لیے کہ اس نے عبادت کی اپنی من چاہی تفسیر وتعبیر پر عمل کیا ہے، ورنہ اس کے خالق اور پروردگار کا اس کے لیے حکم تو کچھ اور تھا، اسے حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے دیگر فرائض کی بجا آوری کرتے ہوئے اپنا باقی وقت والدین کی خدمت میں صرف کرے، اس لیے کہ انہیں اس کی ضرورت ہے، اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل اس کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک اور روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق العباد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

المسلم اخو المسلم، لا یظلمه ولا یسلمه، من کان فی حاجة اخیه، کان الله فی حاجته، ومن فرج عن مسلم کربة، فرج الله عنه بها کربة من کرب یوم القیامة، ومن ستر مسلما، ستره الله یوم القیامة[1]

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے (دشمن کے) سپرد کرتا ہے۔ جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہتا ہے اللہ اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان سے اس کی مصیبت دور کرے گا اللہ اس سے قیامت کے مصائب دور فرمائے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ اس کی پردہ پوشی کرے گا۔

جب کہ ایک روایت میں ایک مسلمان کا وجود دوسرے کے لیے اس قدر ناگزیر قرار دیتے ہوئے فرمایا:

ایک مومن، دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ہر حصہ

۱۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۷۸، رقم ۲۵۸۰

دوسرے حصہ کو مضبوط بناتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے بتایا کہ یوں۔(۱)

دین کا اصل مزاج یہی ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر دیکھنے کا خواہاں ہے، اور دین کے ہر حکم پر اس کی اصل روح کے مطابق عمل پیرا ہونے کا حکم دیتا ہے۔

یہ حکم دین کے کسی خاص شعبے سے تعلق نہیں رکھتا، انسان زندگی کے ہر پہلو پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، عبادات، اخلاق، معاملات سبھی اس کے ذیل میں آتے ہیں، سب کے بارے میں اس کا حکم ایک ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی فرق نہیں۔

ایک شخص اگر پوری ایمان داری سے اپنی زندگی کے تمام فرائض کی بجا آوری کرتا ہے، لیکن نماز کی ادائیگی میں کوتاہی کر جاتا ہے، وہ یقیناً گناہ گار ہے، اور اس کی زندگی ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے ناقص ہے۔

لیکن اگر ایک شخص نماز روزے کی پابندی میں مثالی حیثیت رکھتا ہے، مگر معاملات میں اس کی حیثیت وہ نہیں، مالی امور میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، سود سے بھی شغف رکھتا ہے، رشوت دینے اور لینے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا، دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے بھی کام لیتا ہے، اور موقع ملے تو دوسروں کا مال ناحق کھا جانے میں بھی اسے کوئی تکلف نہیں ہوتا، تو ایسا شخص بھی بلا تکلف اسلام کے مزاج کے مطابق ایک ناقص زندگی بسر کر رہا ہے، اس کا اسلام مکمل نہیں اور اس کے ایمان میں بھی کمی ہے۔

۱۔ بخاری: کتاب الادب، باب تعاون المومنین بعضھم بعضا۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۰۔ رقم ۲۵۸۵

راہ خدا میں مشقتیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے ابتدائی دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں اکثر بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ کو زمین پر لگا دیتا اور اکثر بھوک ہی کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔ ایک روز میں اس راستے پر بیٹھ گیا، جہاں سے لوگ نکلا کرتے تھے۔ اتنے میں وہاں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ گزرے۔ میں نے ان سے قرآن کریم کی ایک آیت کا مطلب پوچھا، اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ میری حالت کو دیکھ کر مجھے کھانا کھلانے کے لیے ساتھ لے جائیں، مگر وہ چلے گئے، اور انہوں نے وہ نہیں کیا جو میں چاہتا تھا۔ (یعنی مجھے کھانا کھلانے کے لیے ساتھ نہیں لے گئے)

پھر میرے پاس سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ گزرے، میں نے ان سے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کا مطلب پوچھا، اس سے بھی میری غرض یہ تھی کہ وہ میری حالت کو دیکھ کر مجھے کھانا کھلانے کے لیے اپنے ساتھ لے جائیں، مگر وہ بھی چلے گئے، انہوں نے بھی میری غرض کو نہیں سمجھا۔

پھر میرے پاس سے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے، آپ ﷺ مسکرائے اور جو کچھ میرے دل میں تھا اور جو چہرے سے ظاہر تھا، آپ فوراً پہچان گئے، اور فرمایا اے ابا ہر! یعنی اے ابو ہریرہ میں نے عرض کیا، حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ آؤ، آپ چل دیے اور میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ آپ ﷺ گھر میں داخل ہوئے اور دیکھا کہ ایک پیالہ دودھ رکھا ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ دودھ کہاں سے آیا ہے۔ گھر والوں نے کہا کہ یہ فلاں نے آپ کے لیے

ہدیہ بھیجا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے اباہر! میں نے عرض کیا، میں حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ۔ اہلِ صفہ کو بلالاؤ۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ صفہ اسلام کے مہمان تھے، نہ ان کا کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ گھر اور نہ ان کے پاس مال تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے کوئی صدقہ آتا تو آپ ﷺ پورا اصحاب صفہ کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ تناول نہ فرماتے، اور اگر آپ ﷺ کے پاس ہدیہ بھیجا جاتا تو آپ خود بھی اس میں سے تناول فرماتے اور اصحابِ صفہ کو بھی اس میں شریک فرماتے۔ اس وقت مجھے یہ گراں گزرا (کہ میں اصحابِ صفہ کو بلالاؤں) اور اپنے دل میں کہا کہ اس ایک پیالہ دودھ سے اصحابِ صفہ کو کیا ملے گا۔ اس پر سب سے زیادہ حق تو میرا تھا کہ اس کو پی کر کچھ قوت وتوانائی حاصل کرتا، اور یہ کہ جب اصحابِ صفہ آجائیں گے تو مجھے ہی اس کی تقسیم کا حکم ملے گا اور تقسیم کے بعد اس دودھ سے میرے لیے شاید کچھ نہ بچے۔ لیکن میرے لیے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا۔

میں اصحابِ صفہ کے پاس گیا اور ان کو بلا کر لے آیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اباہر! میں نے عرض کیا، میں حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے فرمایا یہ لو اور ان کو دو۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے پیالہ لے کر ایک آدمی کو دیا، جب وہ پی کر سیر ہوگیا تو اس نے پیالہ مجھے لوٹا دیا۔ پھر میں نے وہ پیالہ دوسرے آدمی کو دے دیا۔ جب وہ بھی پی کر سیر ہوگیا تو اس نے پیالہ مجھے لوٹا دیا۔ اس طرح جب سب پی چکے تو آخر میں، میں نے پیالہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوٹا دیا۔ آپ ﷺ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا اے اباہر! میں نے عرض کیا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ ﷺ نے فرمایا اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں، میں نے عرض کیا آپ ﷺ نے سچ فرمایا یا رسول اللہ، پھر آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور پینا شروع کردو۔

پس میں نے بیٹھ کر پینا شروع کیا۔ آپ ﷺ بار بار فرماتے پیو اور پیو۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے، اب بالکل گنجائش نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا مجھے دو۔ پھر میں نے پیالہ آپ کو دے دیا تو آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور بسم اللہ پڑھ کر بچا ہوا دودھ پی لیا۔(۱)

فقر و فاقے کی یہ کیفیت تنہا حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی نہ تھی، خود روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ اس وقت کے بہت سے صحابہ اور اصحاب صفہ میں سے ہر ایک کی یہی کیفیت تھی، پھر یہی نہیں، کاشانۂ نبوت کی بھی یہی حالت تھی، اکثر یہ ہوتا کہ صبح کے اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کرتے کہ کھانے میں کچھ ہے، اور جب نفی میں جواب ملتا تو کہتے کہ میں نے روزہ رکھ لیا ہے۔(۲)

اسی طرح ایک دفعہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں سخت بھوکا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کھانے کی کوئی چیز ہو تو بھیج دو۔ جواب ملا کہ پانی کے سوا کچھ نہیں۔ پھر آپ نے دوسرے گھر پتہ کرایا تو وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ اسی طرح تمام ازواج کے ہاں سے پتہ کرایا اور ہر جگہ پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایسے ہی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدل رہے تھے۔(۳)

ایک طرف صحابۂ کرام اور خود نبیٔ رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گزر بسر اور روزہ کے خورد و نوش کی یہ کیفیت تھی، اور دوسری جانب وہ بے مثال خدمت دین ہے، اسلام کی دعوت، تبلیغ، ترویج اور اشاعت کا عظیم الشان کام ہے، جو ان پاک طینت اور مجاہد و جانثار نفوس کے مبارک ہاتھوں سے انجام پایا، جس کی نظیر تک پیش نہیں کی جا سکتی، جس کا آج ہم تصور تک نہیں کر سکتے، جس کی تفاصیل میں جائیں تو ایسی ان گنت باتیں ملتی ہیں جنہیں ہم اپنے اعتبار سے مافوق الفطرت قرار دے سکتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ حقیقت ہے، یہ تمام خدمات انھوں نے بر سر زمین

۱۔ بخاری: ج ۴، ص ۸۶، ۸۷

۲۔ احمد: ج ۲، ص ۴۶

۳۔ سیرت النبی: ج ۲، ص ۲۱۴

پیش کیں، جنھیں جھٹلانا ممکن نہیں۔

اس عظیم مگر عجیب وغریب زندگی سے ہمیں ایک بنیادی سبق ملتا ہے، جو غالباً اوپر ذکر ہونے والے اس طویل واقعے کا ماحصل ہے، وہ یہ کہ دین کی خدمت کے لیے وسائل شرط نہیں، جذبہ اور محنت شرط ہے، نیت اور اخلاص ضروری ہے، آج بہت سے مقامات پر اور بہت سی صورتوں میں ہم یہ سوچ کر عملی اقدام سے گریز کر لیتے ہیں کہ فلاں کام کے لیے موزوں حالات، مناسب وسائل یا ضروری افراد کار دست یاب نہیں ہیں، یا یہ کہ اس کام کو درست انداز میں کرنے کے لیے ہمیں فلاں فلاں سہولتیں درکار ہیں۔

آج بہت سے امور فقط اس لیے انجام نہیں ہو پا رہے کہ وہ امور ہم سے تھوڑی سی قربانی مانگ رہے ہیں، کہیں تو مال و دولت کی قربانی درکار ہے اور زیادہ تر محض آرام و آسائش کی قربانی دینے کی ضرورت ہے، اگر ہمارے سامنے اسوۂ حسنہ ہو، اگر ہمیں صحابۂ کرام اور خود نبیٔ عالی مقام علیہ الصلاۃ والسلام کے حیات طیبہ کے حالات اور واقعات یاد ہوں تو شاید آسائشوں کے اس سراب سے ہم جلد نکل سکیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اصل میدان سے مسلسل ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔

یقیناً کام کرنے کے لیے سازگار ماحول بھی ضروری ہے، یقیناً خدمت دین کے لیے وسائل کی فراہمی بھی ناگزیر ہے، یقیناً کسی بڑے کام کے لیے رجال کار بھی اسی مقام و مرتبے کے درکار ہوتے ہیں، یقیناً یہ سب چیزیں ناگزیر ہیں، ان کی دست یابی ایک دینی ضرورت ہے۔ لیکن دین کی تعلیم، تبلیغ اور ترویج ان سب پر تو کیا ان میں سے کسی ایک پر بھی موقوف نہیں ہے، اگر یہ سہولتیں اور وسائل نہ ہوں، یا ان میں سے کوئی ایک نہ ہو، دین کی خدمت کا فریضہ پھر بھی موجود رہے گا، اور اس کے تمام شعبوں میں خدمات کی ضرورت پھر بھی موجود رہے گی، سو جو اس راہ میں اپنے آپ کو جھونک دے گا وہ کام یاب ہے، خواہ اس کی خدمات کے نتائج فوری طور پر سامنے آئیں یا نہ آئیں، اس لیے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی کام یابی درکار ہے، جو خدائے واحد ولم یزل کے دربار میں سرخ روئی سے مشروط ہے، اور جو وسائل کے انتظار میں بیٹھا رہے گا۔ شاید اس کی قیامت اوروں سے پہلے قائم ہو جائے۔

پھر عرض کر دیا جائے کہ نتائج یقیناً مثبت ہونے چاہییں اور اچھے نتائج یقیناً درکار ہیں،

لیکن وہ نتائج ہمارے ہاتھ میں نہیں، ہمارا کام صرف جہد مسلسل ہے، مثبت انداز میں، حالات کے مطابق، زمانے کے تقاضوں کا لحاظ کر کے اور پوری صلاحیتوں کو صرف کر کے اپنی خدمات نہایت اخلاص کے ساتھ انجام دینا ہی ہمارا وظیفۂ حیات ہے، اسی کے ہم مکلف ہیں، اور اسی کی بابت ہم سے سوال ہوگا۔

عہد نبوی کے اس باب کا مطالعہ ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ نہ تو مشکلات کے گھبرانا ہے نہ وسائل کے انتظار میں اپنے وظیفۂ حیات کو ترک کرنا ہے، جو ہو سکے، جتنا کچھ بھی بن پڑے اسے کر گزرو، یہی صحابۂ کرام کا معمول تھا، یہی اسوۂ نبوی کی تلقین ہے اور یہی عصر حاضر کا ہم سے تقاضا۔

خدا کرے کہ ہم اس تقاضے کو اس کی روح کے مطابق نبھا سکیں، آمین۔

تبلیغ دین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بلغوا عنی ولو آیۃ (۱)

تم میرا پیغام (اقوال، احادیث وغیرہ) لوگوں تک پہنچاؤ، خواہ ایک ہی آیت ہو۔

اسلام کا یہ دعوتی پیغام عام ہے، اس میں کسی طرح کی کوئی تخصیص نہیں ہے، سوائے جاننے کے، ظاہر ہے کہ آگے وہی بات پہنچائی جاسکتی ہے جس کا علم ہو اور ابلاغ کا یہ فریضہ وہی انجام دے سکتا ہے جو خود جانتا ہو، ہاں حدیث میں اس کی وضاحت فرمادی کہ پہنچانے کے لیے جاننے کی کیا حد ہونی چاہئے؟ بتا دیا کہ جتنا جانتے ہو، اسی کو پہنچانے پر کمربستہ ہو جاؤ، دوسری جانب یہ وعید بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمادی:

من سئل عن علم علمہ ثم کتمہ الجم یوم القیامۃ بلجام من نار (۲)

جس کسی سے کوئی بات معلوم کی گئی اور اس نے (جاننے کے باوجود) اسے چھپایا اسے روز قیامت آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

اس طرح بھی اہل علم کو اپنا علم عام کرنے کی تلقین کی گئی مگر اس بات کا خدشہ بہ رحال موجود تھا کہ اس ترغیب کو قبول کرتے ہوئے اور کتمان علم کی وعید سے بچنے کے لیے علم کی جو گرم بازاری ہوگی اور تبلیغ دین کا جو سلسلہ دراز ہوگا تو کہیں اس میں غلط باتیں شامل نہ ہو جائیں اور

۱۔ ترمذی: ج ۴، ص ۳۰۵۔ رقم ۲۶۷۸

۲۔ ترمذی: ج ۴، ص ۲۹۵۔ رقم ۲۶۵۸

رسول اللہ ﷺ کی جانب وہ باتیں نہ منسوب کردی جائیں، جو آپ نے فرمائی ہی نہیں، خواہ وہ فی نفسہ کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہوں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من كذب علی متعمدا فليتبوأ مقعده من النار (۱)

جس کسی نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔

ان اقوال کی روشنی میں آپ ﷺ کی اپنی حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو آپ ہمہ وقت داعی کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، ایک جانب آپ عرب کے بازاروں میں جو خاص ایام میں خاص علاقوں میں لگتے تھے اور عربوں کے باہمی تعلقات کی تجدید اور ملاقات وتبادلۂ خیالات کا اہم ذریعہ تھے، دعوت دین پھیلاتے ہوئے نظر آتے ہیں (۲) اور دوسری جانب آپ منیٰ میں یہ دعوت لوگوں تک پہنچا رہے ہیں:

يا ايها الناس ان الله عز وجل يأمركم ان تعبدوه ولا تشركوا به شيئاً (۳)

اے لوگو! اللہ عزوجل نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

اور کبھی سوق ذی المجاز میں یہ فرما رہے ہیں:

قولوا لا اله الا الله تفلحوا (۴)

لا الٰہ الا اللہ کہہ دو، فلاح یاب ہو جاؤ گے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے اور اس کے مضبوط تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی ذات، سیرت اور کردار کے ذریعے، اپنے روزمرہ کے

۱۔ ترمذی: ج ۴، ص ۲۹۹۔ رقم ۲۶۶۸

۲۔ سیرت ابن کثیر: ج ۲، ص ۱۵۵

۳۔ مسند احمد: ج ۴، ص ۵۴۸۔ رقم ۱۵۵۹۴

۴۔ احمد: ج ۵، ص ۴۵۱

معمولات اور اخلاق کریمانہ کی وساطت سے ہمہ وقت شب و روز اسلام کے آفاقی پیغام کو خلق خدا تک پہنچانے میں مصروف رہے، اور اپنا یہی اسوہ آنے والی نسل انسانی کے لیے راہ عمل بنا کر آپ نے چھوڑا ہے۔

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد فطرت پر ہے۔ جتنے بھی فطری تقاضے ہیں، وہ تمام اسلام کے احکامات ہیں اور جتنے معاملات فطرت انسانی سے متصادم ہیں وہ اسلام کی رو سے ممنوع ہیں، فرق صرف اس قدر ہے کہ کچھ باتیں عام انسانی فہم میں بہ سہولت آجاتی ہیں اور ان کے حسن و قبح سے انسانی ذہن آگاہ ہو جاتا ہے، جبکہ بعض باتیں فہم انسانی سے ماورا ہوتی ہیں، جن کی حقیقت جاننے کے لیے وحی درکار ہوتی ہے۔

اس کے برعکس دیگر تمام ادیان و مذاہب یا تو انسانی ہاتھوں کے ساختہ و پرداختہ ہیں یا ان میں انسانی تصرف نمایاں ہے اس لیے وہ راہ فطرت سے ہٹ گئے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کی تعلیمات میں فطرت سے گریز اور احکام فطرت سے انکار و اعراض نمایاں ہے اس امر کی وجہ سے دوسرے ادیان کی تبلیغ کے لیے خاص تربیت ضروری ہے اور ان کے مبلغین تیار کرنے والے ادارے خاصی محنت کرتے ہیں، مگر اسلام کا مبلغ ہر شخص بن سکتا ہے، یہ ان امتیازات میں سے ایک ہے جو اسلام اور دوسرے ادیان کے درمیان ہیں۔

اس کی بہترین مثال وہ واقعہ ہے، جو متحدہ ہندوستان میں (انگریز کے دور میں) ایک عیسائی مبلغ کے ساتھ پیش آیا تھا جس نے دوران تقریر یہ کہہ دیا تھا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں، اس کی تردید کے لیے ایک نوجوان عالم کھڑے ہوئے، مگر پادری تجربہ کار تھا اور یہ نو عمر تھے، نتیجتاً پادری نے اسے ایسا الجھایا کہ یہ لاجواب ہونے لگے، مگر اسی دوران ایک عام مسلمان اٹھ کھڑا ہوا اس نے نوجوان عالم سے کہا کہ آپ کی بہ جائے جواب میں دوں گا، کیوں کہ یہ بھی جاہل ہے اور میں بھی اور جاہل کا مقابلہ جاہل ہی کر سکتا ہے پھر انہوں نے پادری صاحب سے پوچھا کہ آپ کا یہی دین ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ میاں ان کے باپ ہیں؟ پادری نے کہا ہاں! اب انہوں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی؟ پادری نے کہا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اس کی عمر کیسے متعین کی جا سکتی ہے؟ عمر تو اس کی ہوتی ہے، جو محدود ہو خدا تو لامحدود ہے،

اس پر مسلمان نے کہا کہ ٹھیک ہے، یہ بتایئے کہ اتنی طویل عمر میں اللہ میاں کے ہاں کتنی اولاد ہوئی پادری نے کہا صرف ایک، حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ اللہ کے اکلوتے بیٹے ہیں، وہ بولا لا حول ولا قوۃ اللہ میاں کی عمر تو کھربوں اربوں سال ہے، مگر اولاد صرف ایک ہی ہوئی، میری عمر دیکھو ۵۲ سال ہے اور بارہ بچے ہیں تو اللہ میاں کی ایک ہی کیوں؟ عوام نے یہ سن کر فوراً تالی بجادی اور یوں یہ مناظرہ پادری کی شکست پر ختم ہوگیا(۱)

اس بہ ظاہر سادے سے واقعے سے سبق ملتا ہے کہ اسلام کی دعوت پہنچانا کوئی مشکل امر نہیں ہے مشکل امر یہ ہے کہ ہم اس کو بھی کام سمجھیں اور اس کے لیے بہت سے لایعنی امور میں صرف ہونے والے وقت کا کچھ حصہ وقف کردیں۔

اسلام کا مبلغ بننا درحقیقت فطرت کا مبلغ بننا ہے اور اسلام کی دعوت دوسروں تک پہنچانا درحقیقت فطرت کا پیغام دوسروں تک پہنچانا ہے اور فطرت کا پیغام جلد سنا جاتا ہے کیوں کہ ہر ایک میں فطرت کی طلب موجود ہے، اس لیے اسلام کا داعی اور مبلغ بننا اتنا ہی آسان ہے جتنا خود اپنی فطرت کی آواز کو لفظوں میں بیان کرنا۔

اسلام کی اس صفت نے اس کے دعوتی پہلو اور اس کی تسخیر کرنے کی صلاحیت میں اس حد تک اضافہ کردیا ہے کہ اب صرف اسلام کے پیغام کو مخاطب کی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق اس کے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے، آج کے دور میں اسلام بہت سے ایسے حلقوں اور علاقوں سے فاتح مذہب کے طور پر سامنے آرہا ہے جن کے بارے میں ایسا تصور بھی ممکن نہیں تھا دیکھا جائے تو **بلغوا عنی ولو آیۃ** کی معنوی اہمیت آج ہم پر زیادہ واضح انداز میں اجاگر ہو رہی ہے اور پادری والا واقعہ اس کا ایک اہم مظہر ہے۔

ایسے میں ضرورت صرف مشنری اسپرٹ کے ساتھ ہر مسلمان کے داعی بن جانے کی ہے، اللہ تعالیٰ قول سے بڑھ کر عمل کرنے کی توفیق مرحمت کریں، آمین

۱۔ مولانا وحید الدین خان۔ عظمت اسلام: ص ۱۲۶

سمجھانے کا طریقہ

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے۔ قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی۔ عورت کو قیدیوں میں ایک بچہ نظر آیا تو اس نے شدت جذبات اور فرطِ محبت میں اس بچے کو گود میں اٹھایا اور اُسے اپنے پیٹ سے چمٹا لیا اور اپنا دودھ پلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محسوس کیا کہ اس عورت کے جذبۂ محبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بہت متاثر ہیں۔ آپ نے اس تاثراتی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

اترون هذه طارحة ولدها فی النار؟

اگر اس عورت کو اختیار دے دیا جائے تو کیا یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا:

لا وهی تقدر علیٰ ان لا تطرحه

اللہ کی قسم! یہ عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فقال الله ارحم بعباده من هذه بولدها

یہ عورت اپنے بچے پر جتنی مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔(۱)

۱۔ بخاری۔ کتاب الادب: باب رحمۃ الولد رقم ۵۹۹۹۔ مسلم۔ کتاب التوبۃ: باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ، رقم ۲۷۵۴

اسی طرح صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک گاؤں سے واپسی پر مدینے کے بازار سے گزر رہے تھے۔ لوگوں نے آپ کو دونوں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہاں چھوٹے کانوں والا ایک مردہ بکری کا بچہ پڑا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے کان پکڑے اور فرمایا:

ایکم یحب انّ ھذا له بدرھم؟ فقالوا ما نحب انه لنا بشیءٍ وما تصنع به؟ قال اتحبون انه لکم؟ قالو واللہ لو کان حیاً کان عیباً فیه لانّه اسک فکیف وھو میت، فقال فواللہ للدنیا اھون علی اللہ من ھذا علیکم (۱)

تم میں سے کون اس مردہ بچے کو ایک درہم میں خریدنے کے لیے تیار ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہم کسی بھی قیمت پر اس کو خریدنا نہیں چاہتے۔ یہ ہمارے کسی کام کا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ یہ تم کو مل جائے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی کان چھوٹے ہونے کا عیب اس میں تھا۔ اور اب تو یہ مردہ ہے۔ اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اب اسے کوئی خریدے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ! یہ بچہ تمہاری نظر میں جس قدر بے قیمت ہے، اللہ کی نظر میں دنیا کی قدر و قیمت اس سے بھی زیادہ بے حیثیت ہے۔

سوال قدرت کا عطیہ ہے، انسان کی ساری علمی و عملی تگ و دو کی بنیاد سوال ہے، سوال بہت سے ذہنوں میں خود پیدا ہوتا ہے، یہ تربیت یافتہ ذہن کی علامت ہے، ایسے ذہن کی علامت جو آگے بڑھنے کا خواہاں ہے، جو ہر بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ کائنات کے راز اس پر آشکار ہو جائیں، وہ نظام کو سمجھ کر اس کو برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ انسانوں کی ایک قسم ہے۔ ایک اور قسم وہ ہے، جو حالات کے رخ پر اپنے آپ کو بہنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بھی ہمہ وقت رواں دواں رہتے ہیں، مگر اپنی رائے، مرضی اور خواہش

۱۔ مسلم: کتاب الزہد، باب الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر، رقم ۲۹۵۷

سے نہیں، یہ اپنی فہم وفراست اور سمجھ بوجھ پر تکیہ اور اعتماد نہیں کر پاتے۔ یہ دو طبقے ہیں۔ دونوں کو تربیت فراہم کرنے کے الگ الگ طریقے ہیں۔ لیکن یہاں ایک طبقہ اور بھی ہے، یہ طبقہ انتہائی احترام کی وجہ سے بھی سوالات نہیں کر پاتا، اس لیے جناب رسول اللہ ﷺ نے سوال کو علم کا آدھا حصہ قرار دیا، فرمایا:

السوال نصف العلم

سوال نصف علم ہے۔

ان بیان شدہ واقعات میں رسول اکرم ﷺ نے سوالات پیدا کیے، اور صحابہ کرام کے ذہن میں چھوڑے، پھر انہیں مثال کی شکل عطا کی اور اسے اہم باتوں کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا ہے۔

ان واقعات میں ایک بات اور بھی اہم ہے، اور قابل توجہ بھی۔ رسول رحمت ﷺ نے ماحول سے فائدہ اٹھا کر دیکھنے والوں کے ذہنوں میں ایک ابدی حقیقت پیوست کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کا عمومی مزاج یہ ہے کہ وہ موت اور میت کے ذکر سے خوف بھی کھاتا ہے، اور اگر ایسی صورت حال پیش آجائے تو جلد متاثر بھی ہوتا ہے اگرچہ تو یہ تاثر دائمی نہیں ہوتا، نہ یہ تاثر دائمی رہ سکتا ہے، ایسا ہو جائے تو پورا نظام حیات معطل ہو کر رہ جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت ہے۔ اسی لیے بکری کے جب مردہ بچے کے پاس سے صحابہ کرام گزرے تو یہ تاثر تو پیدا ہوا، مگر یہ تاثر جلد رخصت بھی ہو سکتا تھا، مگر آپ ﷺ نے اپنے ایک مختصر جملے سے اسے دیرپا بنا دیا۔

اسی طرح آگ کا معاملہ بھی واضح ہے۔ انسان سب سے زیادہ خوف اور اذیت اس تصور سے محسوس کرتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ بھی آگ سے متاثر ہو جائے۔ رسول خدا ﷺ نے اس تصور کو ایک جیتی جاگتی مثال بنا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک تصور پیدا کیا، اور اسے اپنے اعجاز بیان سے دل ودماغ میں محفوظ کر دیا۔

یہ اسلوب ہمارے لیے چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی رہ نمائی ہے۔ ہمارے سامنے ایسے بے شمار واقعات بکھرے ہوئے ہیں، مگر ان کو دیکھنے والی آنکھیں، ان کو سمجھنے والا دماغ، ان سے اثر لینے اور قبول کرنے والا دل، اور اسے آگے منتقل کرنے اور درس عبرت بنانا نے والا جذبہ

درکار ہے۔ کاش یہ نعمتیں ہمیں میسر آجائیں تو ہم کتنے ہی لوگوں کی ہدایت کا سبب بن سکتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ہماری اپنی اصلاحِ احوال کے اسباب بھی بہم ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فہم و عمل کے راہ آسان فرمائے۔ آمین

نئے امکانات کی تلاش

مدینہ منورہ کے معروف سردار ابوالحیسیم ایک بار مکے آئے، ان کے ہم راہ بنی عبدالاشہل کے کچھ نوجوان بھی تھے، ان میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھے۔ (یہ بعد میں مسلمان ہوئے اور ان کی خدمات سے سیرت کے قارئین واقف ہیں) ان کی آمد کا ایک ہی مقصد تھا کہ قبیلۂ خزرج کے مقابلے میں (یہ مدینے کا طاقت ور قبیلہ تھا) قریش کو حلیف بنایا جائے۔ رسول اکرم ﷺ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ ان کے پاس پہنچ گئے، ان کے پاس بیٹھے اور فرمایا:

هل لكم الى خير مما جئتم له؟ فقالوا وما ذاك؟ قال انا رسول الله بعثني الله الى العباد، ادعوهم الى الله ان يعبدوا الله ولا يشركوا به شيئاً، وانزل على الكتاب ثم ذكر الاسلام وتلا عليهم القرآن، فقال اياس بن معاذ وكان غلاماً حدثاً اى قوم، هذا والله خير مما جئتم له (۱)

تم جس مقصد سے آئے ہو، اگر میں تمہیں اس بہتر چیز بتاؤں؟ انہوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، مجھے اللہ نے بندوں کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ انہیں اللہ کی طرف بلاؤں، وہ اسی کی عبادت کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اس نے مجھ پر ایک کتاب نازل کی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اسلام کا ذکر کیا، اور ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی۔ یہ سن کر ایاس بن معاذ نے، جو اس وقت نوجوان تھے، یہ

۱۔ ابونعیم۔ دلائل النبوۃ

کہا کہ خدا کی قسم یہ اس سے بہتر ہے، جس کے لیے تم آئے ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ ایک طرح سے خاموش دعوت تھی۔ یہ مکے کا قصہ ہے، جس کے کوچہ و بازار اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اجنبی بن چکے تھے، وہاں بوڑھے و جوان سب ہی آپ کے دست و بازو بننے سے انکاری تھے، نہ صرف انکاری تھے، بل کہ وہ اپنے سابقہ موقف پر اس قدر مصر تھے کہ اس کے مقابل کسی بھی صدا سے اجنبیت اور وحشت محسوس کرتے تھے، خواہ وہ صدا الصادق والامین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زبان مبارک سے کیوں نہ ادا ہوتی ہو۔ اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، کانٹے بچھانا اور طرح طرح سے مشکلات پیدا کرنا اپنی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی ذمے داری خیال کرتے تھے۔ ایسے موسم اور ایسے ماحول میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بلاغتِ بیان سے نئے چہروں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی سعی و کوشش فرما رہے ہیں۔

دوسری جانب مدعو بھی وہ سردار ہے، جو سیاسی اونچ نیچ اور اپنے مفادات کو خوب جانتا ہے۔ وہ اپنی سیاسی قوت میں اضافے کی غرض سے ہی اتنا سفر طے کر کے یہاں آیا ہے۔ وہ خطرات سے کھیلنے کے لیے نہیں اپنے خطرات کم کرنے کی غرض سے آیا ہے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سامنے کوئی سیاسی لائحہ عمل نہیں رکھتے، نہ اس کی تالیف قلب کے لیے، اس کی ہم دردی اور توجہ حاصل کرنے کی غرض سے یہ کرتے ہیں کہ اپنا پیغام ملفوف کر کے، سیاسی انداز اختیار کر کے اور اس سردار کی من پسند گفت گو میں لپیٹ کر پیش کریں۔ یقیناً لہجہ اور اسلوب نبوت کا تھا، جو دل موہ لینے والا ہی ہو سکتا ہے، مگر غیر ضروری ملمع سازی نہیں فرمائی گئی، کیوں؟ صرف اس لیے کہ اسلام کے سادہ سے پیغام میں ہی اس قدر قوت اور جاذبیت موجود ہے کہ معاندین اور ضد پر اترے ہوئے افراد کو چھوڑ کر ہر ایک کے لیے اس کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اکثریت کو آج تک اسلام میڈیا کے ذریعے ہی معلوم ہوا ہے، جس میں ہماری نالائقی اور اسلام مخالف قوتوں کی چالاکی دونوں شامل ہیں۔ اس لیے اس تصور کو مکمل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور نامکمل تصویر سے دلوں میں پیدا ہونے والے شبہات کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی اس نامکمل تصویر سے کوئی نامناسب پیغام اخذ کر لے تو اس کی سو فیصد ذمے داری اس پر کیسے ڈالی جا سکتی ہے؟

ہماری کم زوریوں میں چند باتیں نمایاں ترین ہیں، اور ان کے برے اثرات واضح تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے حوالے سے ہمیں اس بیان میں رہ نمائی ملتی ہے۔

الف: ہمارے سامنے اکثر اوقات ہدف تو ہوتا ہے، لیکن غیر واضح، یہی سبب ہے کہ ہماری حالت اس روایتی لطیفے سے کم نہیں ہوتی، جس میں کسی طاقت ور مگر اسلام سے نابلد شخص نے کسی غیر مسلم کو دبوچ لیا، اور بہ زورِ طاقت اس سے کلمۂ توحید پڑھنے کا تقاضا کیا۔ مجبور شخص نے حامی بھر لی کہ چلو پڑھا دو۔ یہ سن کر اس نے اسے چھوڑ دیا، اور مدت العمر افسوس کرتا رہا کہ کاش مجھے کلمہ آتا تو آج ایک غیر مسلم کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کرنے کا شرف حاصل کر لیتا۔

ہمیں بھی یہ تو یاد ہے کہ اسلام کا پیغام عام کرنا ہے، مگر وہ پیغام ہے کیا، شاید یہ بات ہمیں تفصیل کے ساتھ جاننے کی از سرِ نو ضرورت ہے۔

ب: ہمارے ساتھ یہ بھی دقت ہے کہ ہمیں اگر ایک جانب سے کام ہوتا دکھائی نہ دے تو ہمیں سارے راستے ہی بند اور مسدود محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اس واقعے میں پیغام یہ ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، بل کہ اللہ تعالیٰ جب ایک راستہ بند کرتا ہے تو کچھ دوسرے راستے کھول دیتا ہے، انسان کا اس وقت اصل امتحان یہ ہوتا ہے کہ وہ نئے راستوں کو تلاش کرے، جو اللہ تعالیٰ نے کھول تو دیے ہیں، مگر ہماری نظر سے اوجھل ہیں، اور ہماری ذمے داری یہ ہے کہ انہیں ہم ڈھونڈ نکالیں اور انہیں اپنے نئے امکانات کی بنیاد بنالیں۔

ج: نئے راستوں کا مفہوم یہ ہے کہ اس حدود میں رہتے ہوئے نئے امکانات تلاش کرنا، جو پہلے سے متعین ہے، ان تمام آداب کے ساتھ، جو اس کے ساتھ تعلیم کیے گئے ہیں۔ ہمارا ایک المیہ یہ بھی ہے، اور یہ سخت افسوس کا مقام ہے کہ ہم کسی کام کو ایک بار اگر دینی ضرورت قرار دے دیں تو پھر اس کے لیے ہر راستہ اختیار کرنا، ہر ذریعے کو کام میں لانا اور ہر طریقے سے ہدف حاصل کرنا عین لازم جانتے ہیں۔ ایسے میں پھر جائز ناجائز، ضروری غیر ضروری اور حلال حرام کی بحث ہمارے لیے لایعنی ہو جاتی ہے۔ ہمارے سامنے درجنوں ایسے واقعات ہیں، جب اسلام کے نام لیواؤں نے اسلام کے ہی نام پر ایسے ایسے رنگ اختیار کیے کہ زبان درازوں کو خود اسلام پر طنز اور لعن کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ صورت حال کیسے درست ہو سکتی ہے؟ اور اس کے نتائج آخر کس طرح درست نکل سکتے ہیں؟

د: پیغام نبوت پر اعتماد بھی اس واقعے سے ہمیں ملتا ہے کہ اسے اپنی اصل صورت میں حکمت کے ساتھ، موقع اور محل کی نزاکتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کسی کو پیش کر دیا جائے تو وہ اپنی جگہ خود بنا تا ہے۔ اس حوالے سے بہت سے تحفظات غیر ضروری ہیں۔ یہ وہ پیغام ہے، جس کی کشش آج بھی پہلے زمانے کی طرح برقرار ہے، ضرورت صرف عمل کی ہے کہ اس میدان میں بھی آزمائش کی شرط ہے۔

دل کی صفائی

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی تمہارے سامنے ایک شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے۔ چناں چہ ایک انصاری صحابی آئے، جن کی ڈاڑھی سے تازہ وضو کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ بائیں ہاتھ میں اپنے نعلین لیے ہوئے تھے، پھر جب دوسرا روز ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا، اور پھر یہی صاحب سامنے آئے، تیسرے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا اور یہی شخص اپنی مذکورہ حالت میں داخل ہوا۔

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اٹھ گئے تو حضرت عبد اللہ بن عمروؓ بن العاص اس شخص کے پیچھے چلے اور ان سے کہا کہ میں نے کسی جھگڑے میں قسم کھالی ہے کہ میں تین روز تک اپنے گھر نہ جاؤں گا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو تین روز مجھے اپنے یہاں رہنے کی جگہ دے دیں، انہوں نے منظور فرمالیا، عبد اللہ بن عمروؓ نے یہ تین راتیں ان کے ساتھ گزاریں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں دیکھا کہ رات کو تہجد کے لیے نہیں اٹھتے، البتہ جب سونے کے لیے بستر پر جاتے تو کچھ اللہ کا ذکر کرتے تھے، پھر صبح کی نماز کے لیے اُٹھ جاتے تھے، البتہ اس پورے عرصے میں میں نے ان کی زبان سے کلمۂ خیر کے سوا کوئی کلمہ نہیں سنا، جب تین راتیں گزر گئیں اور قریب تھا کہ میرا دل ان کے اس عمل کو حقیر تصور کرنے لگے تو میں نے ان پر اپنا راز کھول دیا کہ ہمارے گھر میں کوئی جھگڑا نہیں تھا، البتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین روز تک یہ سنتا رہا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے اور اس کے بعد تینوں دن آپ ہی آئے، اس لیے میں نے چاہا کہ میں آپ کے ساتھ رہ کر دیکھوں کہ آپ کا وہ کیا عمل ہے جس کے سبب یہ فضیلت آپ کو حاصل ہوئی، مگر عجیب

بات ہے کہ میں نے آپ کو کوئی بڑا عمل کرتے نہیں دیکھا تو وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو اس درجے پر پہنچایا، انہوں نے کہا، میرے پاس تو اس کے علاوہ کوئی عمل نہیں جو آپ نے دیکھا ہے۔ میں یہ سن کر واپس آنے لگا تو مجھے بلا کر کہا:

ما هو الا ما رأيت غير انی لا اجد فی نفسی لاحد من المسلمين غشا، ولا احسد احدا علی خير اعطاه الله اياه، فقال عبد الله هذه التی بلغت بک وهی التی لا نطيق (۱)

ہاں ایک بات اور ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کینہ اور برائی نہیں پاتا، اور کسی ایسے شخص پر حسد نہیں کرتا جس کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اچھی چیز عطا فرمائی ہو۔ عبداللہ بن عمروؓ نے کہا کہ بس یہی وہ صفت ہے جس نے آپ کو یہ بلند مقام عطا کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سینے اور دل کی صفائی ایک مومن کے لیے ابتدائی ضرورتوں میں سے ایک ہے، انسان کا دل بالخصوص جب کہ وہ مسلمان بھی ہو، کسی طرح بھی حسد، کینے، بغض، عداوت اور بدگمانی جیسی برائیوں کو اپنے اندر رکھنے اور انہیں سمو لینے کی اہلیت نہیں رکھتا، نہ وہ اس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے، اسے تو حالات، حوادث، معاشرہ اور ماحول ایسے سانچے میں ڈال دیتا ہے جس کے سبب وہ بالآخر برائیوں کا آماج گاہ بن جاتا ہے، یہ فطرت سے انحراف کی صورت ہے، ورنہ صحیح انسانی اور سلیم فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کا دل ان برائیوں سے یک سر پاک اور خوف خدا سے معمور ہو۔

اسلام نے دل کی اسی اہمیت کی بنا پر اس کی صفائی اور برے اخلاق، غلط خیالات اور پراگندہ تصورات سے اسے پاک رکھنے کی سخت تاکید کی ہے، اس لیے کہ ایک ہمدرد انسان جو مخلوق خدا کا غم گسار اور خدمت گار ہو، اپنی زندگی پر صابر و شاکر اور قناعت کی صفت سے مالا مال ہو، اور حسد، کینے اور بغض جیسی مہلک بیماریوں سے پاک صاف ہو وہ ایسے انسان سے یقیناً کئی درجے بہتر ہے جو مخلوق خدا کی طرف سے بدگمان ہو اور اپنے دل میں طرح طرح کی

ا۔ احمد: ج ۳، ص ۶۴۶۔ رقم ۲۲۸۶ اور قم ۱۲۷۲۰۔ نسائی۔ کبریٰ: ج ۶، ص ۲۱۵۔ رقم ۱۰۶۹۹

سازشیں، شکایتیں اور عداوتیں رکھتا ہو، کیوں کہ یہ برائیاں رفتہ رفتہ دل میں جڑ پکڑ جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ اسے سیاہ کر دیتی ہیں، اور سیاہ دل انسان کے ظاہر و باطن دونوں کے لیے ضرر رساں اور نقصان دہ ہے، وہ انسان کے باطن کی رعنائی کو بھی شدید نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے ظاہر پر بھی براہِ راست اثر انداز ہو کر اسے دھندلا کر دیتا ہے۔ اسی لیے سچے لوگوں اور صاف ستھرا دل رکھنے والوں کو باقی تمام انسانوں پر فضیلت عطا فرمائی گئی ہے۔

عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا، اے اللہ کے رسول، کون لوگ افضل ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> جو صاف ستھرے دل کا مالک ہو، اس کی زبان سچی ہو، سوال ہوا سچی زبان سے تو ہم واقف ہیں لیکن صاف دل کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا، جو متقی ہو، برائیوں سے صاف ہو، اس میں گناہ ہو نہ نافرمانی، حسد ہو نہ کینہ۔ (۱)

نبیٔ برحق رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاشرے کی تشکیل کے لیے ہدایات فرمائی ہیں، اس کی نمایاں پہچان یہ ہے کہ وہ باہمی محبت و الفت، تعلق، دوستی و بھائی چارگی، تعاون، ایثار اور خیر خواہی کے بلند جذبات پر قائم ہو، اور حسد، کینے اور بغض و عداوت کا مفہوم ان کے لیے اجنبی ہو، اب اگر ہمارے گرد و پیش میں ایسا نہیں ہے، یا ہمارا ماحول اس سے مختلف ہے تو ہمیں خود سوچنا چاہیے کہ اس میں ہمارا اپنا کس قدر حصہ ہے؟ اور نبوی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں ہم نے اپنا حصہ کس قدر شامل کیا ہے؟

دلوں کا صاف نہ رہنا اکثر اوقات قطع تعلقات تک پہنچا دیتا ہے، جب کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صلہ رحمی فرض اور قطع رحمی ناجائز ہے، اسلام کا ایک مزاج یہ ہے کہ وہ برائی کے پروان چڑھنے سے پہلے ہی اس کی بیخ کنی کی کوشش کرتا ہے، اور ظلم و زیادتی کے اسباب ختم کرنے کے لیے ایسی تدابیر تجویز کرتا ہے، جن کو اختیار کر لینے سے برائی کے پھیلنے کے احکامات کم سے کم ہو جاتے ہیں، انسانی زندگی جن ادوار سے گذرتی ہے ان میں لازماً ایسے بہت سے مواقع پیش آتے ہیں جب انسان اپنے مزاج کے تفاوت کے اعتبار سے کم یا زیادہ

۱۔ ابن ماجہ

کی نہ کسی حد تک ضرور غصے اور غم کا شکار ہو جاتا ہے، اور اس کے دوسرے لوگوں سے تعلقات خرابی کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ ایسا موقع ہوتا ہے جب انسان کے اندر بدگمانی، عداوت، بغض اور کینے جیسی برائیاں جنم لیتی ہیں، اس لیے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں باہمی معاملات کو صدق وامانت سے طے کرنے کی تلقین کی وہیں یہ تاکید بھی فرمادی۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایاکم و الظن فان الظن اکذب الحدیث ، ولا تحسسوا ، ولا تجسسوا، ولا تحاسدوا، ولاتدابروا، ولا تباغضوا، وکونوا عباد اللہ اخوانا (۱)

بدگمانی سے بچتے رہو، کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، لوگوں کے عیب معلوم کرنے کے درپے نہ رہو، حسد نہ کرو، کسی کی پیٹھ پیچھے برائی نہ کرو۔ بغض نہ رکھو، اور تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔

دلوں کو پاک رکھنے کے لیے ہی اسلام نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ غیبت سے محفوظ رہو، کیوں کہ اس کا خمیر بھی بغض کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور پھر عداوتوں کے ایک طویل سلسلے کا پیش رو بنتا ہے، درحقیقت اس کے ذریعے اندر کا کینہ باہر نکل آتا ہے، اس طرح یہ ایک نہیں کئی ایک برائیوں کا مجموعہ ہے۔ غیبت کی تعریف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمائی ہے، چناں چہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ غیبت کیا چیز ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کسی کا اپنے بھائی کے متعلق ایسی باتیں بیان کرنا جو اسے ناگوار ہوں۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ اگر اس میں واقعی وہ بات موجود ہو جو میں کہتا ہوں؟

ان کان فیہ ماتقول، فقداغتبتہ، وان لم یکن فیہ، فقدبھتہ (۲)

۱۔ بخاری: ج ۴، ص ۴۳

۲۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۱، رقم ۲۵۸۹۔ ترمذی: ج ۳، ص ۷۵ ۳، رقم ۱۹۴۱

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جو کچھ کہو اگر وہ واقعی اس میں موجود ہو تو یہ غیبت ہوگی اور اگر اس میں وہ بات نہ ہو جو تم کہہ رہے ہو تو یہ بہتان ہوگا۔

پھر بغض اور کینے کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان نہ صرف بدگمانیوں کا شکار دینے لگتا ہے، بلکہ وہ دوسروں کے عیوب کی تلاش میں بھی سرگردانی کا مظاہرہ کرتا ہے، پھر جب اس کے ہاتھ ایسی کوئی چیز لگ جاتی ہے تو اسے بلا تحقیق آگے بڑھانے کا بھی مرتکب ہوتا ہے، یہ سب باتیں کسی اصلاح پسند معاشرے کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہیں، اس لیے ان سب سے منع فرمایا گیا، فرمان نبوت ہے:

من ستر مسلما ستره الله فی الدنيا والآخرة (۱)

جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ اس کی دنیا و آخرت دونوں میں پردہ پوشی فرمائے گا۔

آخر ہم میں سے ایسا کون ہے جسے اپنے دینی و دنیاوی معاملے میں پردہ پوشی کی حاجت نہ ہو؟ سو جب ہم سب ہی اللہ تعالیٰ کی پردہ پوشی کے محتاج ہیں تو اس کی مخلوق کی پردہ پوشی کرکے یہ سہولت کس قدر آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاق حسنہ سے مزین فرمائے۔ آمین

---

(۱) مسلم: رقم ۲۶۹۹

دلوں کی نرمی

مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ایک صحابیٔ رسول ہیں، وہ ایک وفد کے ہم راہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے اور کئی روز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی پررونق و بابرکت مجلس سے فیض یاب ہوتے رہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم رحيما رقيقا (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔

رحم دلی، نرمی اور رقتِ قلب اچھے انسان کی بنیادی صفات میں سے ہیں، ہر طرح کی اچھائی اور بھلائی اس سے وابستہ ہے، خود ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

من يحرم الرفق يحرم الخير (۲)

جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی سے محروم ہے۔

اور دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی اور رفق کو اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرمی اور نرم دلی پر بیش بہا انعامات فرماتے ہیں۔ فرمایا:

ان الله رفيق يحب الرفق ويعطى على الرفق ما لا يعطى على العنف وما لا يعطى على ما سواه (۳)

۱۔ مسلم: ج۱، ص۳۷۷، رقم ۶۷۴

۲۔ مسلم: ج۴، ص۱۸۲، رقم ۲۵۹۲

۳۔ مسلم: ج۴، ص۱۸۲، رقم ۲۵۹۳

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر انسان کو وہ کچھ عطا کرتا ہے جو وہ نہ تو سختی پر عطا کرتا ہے نہ اس کے سوا کسی اور چیز پر۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو جن اچھے اخلاق کی تعلیم دی ہے، اور صفات کو اپنانے کی تاکید کی ہے ان میں سے ایک اہم صفت نرم دلی ہے، یہ ایک فطری صفت ہے جو پیدائشی اور خلقی طور پر انسان میں ودیعت کی گئی ہے، کیوں کہ نرم دل شخص صرف ایک اچھی صفت کا ہی حامل نہیں ہوتا بل کہ وہ بہت سی عمدہ صفات کا جامع ہو جاتا ہے، جن میں ہمدردی، خیر خواہی، رحم دلی، خدمت خلق، سخاوت اور شجاعت وغیرہ شامل ہیں۔

رسول اکرم، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحم دلی اور نرم خوئی اس لیے بھی تمام انسانوں سے بڑھ کر ہے کہ آپ افضل البشر ہیں، جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ تمام صفاتِ حسنہ کا جامع اور مکمل ترین نمونہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کی صورت میں ہی ہمیں حاصل ہوسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور نمونے کو خواہ وہ کسی قدر ہی متعارف، مشہور اور کامل کیوں نہ محسوس ہو، مکمل، اکمل اور جامع قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اس خاص پہلو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نرمی کے بارے میں خود قرآنِ حکیم کی گواہی بھی موجود ہے۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ (۱)

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان (صحابہ رضی اللہ عنہ) پر نرم دل ہیں، اور اگر آپ تندخو، سخت دل والے ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے ہٹ جاتے، سو آپ انہیں معاف کر دیں اور ان کے لیے (اللہ سے) بخشش کے طلب گار ہوں اور ان سے کاموں میں مشورہ لیا کریں۔

۱۔ آل عمران: ۱۵۹

قرآن حکیم کی اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر بعض مسلمانوں کی لغزش اور ان کی جانب سے میدان میں اپنی مقررہ جگہ چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوا، اس کا نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کو سخت صدمہ اور دلی غم ہوا تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طبعی نرمی کے سبب متعلقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سختی کا معاملہ نہیں فرمایا اور درگزر سے کام لیا، لیکن مسلمانوں میں سے بعض انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور اس لغزش کے سبب ان سے تعلق اور روابط میں فرق آگیا، ان سے مشورہ بھی نہیں کیا جاتا تھا، یہ بات ان کی دل شکنی کا باعث ہوتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرما دیا کہ آپ انہیں معاف کردیں اور ان سے اللہ کے حق کی ادائیگی میں جو کوتاہی ہوئی ہے اس کے لیے اللہ سے ان کی مغفرت طلب کریں اور انہیں پہلے کی طرح اپنے اجتماعی معاملات میں شریک کرلیں۔(۱)

یہ آیت مبارکہ دعوتِ اسلام کے حوالے سے بھی نرمی اور نرم دلی کی اہمیت کو ہمارے سامنے اجاگر کرتی ہے، جو لوگ اصلاح و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے سلسلے میں سرگرم ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نرم دلی، خوش طبعی، عفو درگزر، تلطف و مہربانی اور حسن خلق کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں اور قساوت قلبی، سختی و درشتی اور شدت جیسی صفات سے پاک، کیوں کہ دعوتی زندگی میں ان کی اہمیت مسلم بھی ہے اور ان کی ضرورت قرآن اور شواہد و قرائن سے ثابت بھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں بہت سے ایسے واقعات ہوئے جب نرمی خوئی اور رحم دلی کے مظاہرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے آئے، اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل حیات طیبہ میں ان صفات کا عکس نظر آتا ہے، لیکن بعض مواقع پر آپ ﷺ کی یہ صفات خاص طور پر سامنے آتی ہیں، مثال کے طور پر ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے روایتی جارحانہ اور مخالفانہ انداز میں آں حضرت ﷺ کو سلام کرتے ہوئے انہوں نے کہا: السام علیکم! عربی میں سام

۱۔ تفسیر ابن کثیر: ج ۱، ص ۴۹۱

کے معنی موت کے آتے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی اس موقع پر موجود تھیں، انہوں نے یہودیوں کی اس واضح اشتعال انگیزی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا:

وعليكم السام والذم

تم پر موت آئے اور لعنت ہو۔

ہر چند کہ اس اشتعال انگیزی کی ابتدا یہود کی جانب سے ہوئی تھی، مگر ان کے جواب میں بھی یہ جملہ کہنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

یا عائشة، لا تكوني فاحشة

اے عائشہ بے ہودہ گوئی کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

یا عائشة ان الله يحب الرفق في الامر كله

عائشہ! ٹھہر جاؤ، اللہ تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

الم تسمع ما قالوا؟

یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) انہوں نے جو کچھ کہا، کیا آپ نے نہیں سنا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بلى قد سمعت، فرددت عليهم

میں نے ضرور سنا اور اس کا جواب بھی دے دیا کہ ''علیکم'' تم پر ہو(۱)

یعنی صرف اسی قدر کہنا جب کافی تھا تو مکمل جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو جاننے اور ایسے مواقع پر آپ کی جانب سے نرم دلی کے اظہار کی حقیقت و کیفیت کو سمجھنے کے لیے یہ ایک واقعہ ہی کافی ہے۔

نرمی و نرمی خوئی کی اسی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

۱۔ مسلم: ج ۳، ص ۴۱۳۔ رقم ۲۱۶۵، ۲۱۶۶، ۲۱۶۷

ان الرفق لا یکون فی شیء الا زانه، ولا ینزع من شیء الا شانه (۱)

نرمی جس چیز میں بھی موجود ہو اسے مزین کر دیتی ہے اور یہ صفت جس چیز سے علیحدہ کر لی جائے اسے بدنما بنا دیتی ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رفق اور نرمی کے وصف کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

حرم علی النار کل ہین لین سہل قریب من الناس (۲)

وہ شخص آگ پر حرام ہے جو نرم ہو، آسان ہو، جو لوگوں کے قریب ہو۔

نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کا ہم سے تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی استطاعت بھر کوشش کریں کہ ہم سے رفتہ رفتہ دور ہو جانے والی ان صفات کا ہم سے تعلق پھر استوار ہو اور ہم عملاً بھی امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیہ کہلانے اور اس میں شمولیت کے اعزاز و فضیلت کے حق دار بن سکیں۔ آمین

۱۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۳۔ رقم ۲۵۹۴

۲۔ احمد: ج ۱، ص ۶۸۴۔ رقم ۳۹۲۸

افراط وتفریط کے درمیان

ایک دفعہ تین صحابہ کرامؓ کاشانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے اور آپ کی عبادت کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں، پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں پوری رات شب بیداری میں گزارا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے سے رہوں گا، تیسرے نے کہا میں کبھی عورت کے پاس نہیں جاؤں گا، اس گفت گو کی اطلاع جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ تم لوگوں نے یہ کیا بات طے کی ہے۔

اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ، لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء، فمن رغب عن سنتی فلیس منی (۱)

خدا کی قسم میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہوں، اور اس کا اطاعت گزار بھی ہوں، لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور رات میں سوتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں، لہٰذا سن لو کہ نکاح میری سنت ہے، اور جو شخص میرے اس طریقے سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

نبیٔ رحمت علیہ الصلاۃ والسلام نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال کی تلقین کی ہے اور افراط وتفریط سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، اسلام کا مطلوب ایسا شخص ہے جو ہر معاملے میں میانہ روی کو پیش نظر رکھے اور اس کا طرز عمل افراط وتفریط دونوں سے یکسر پاک ہو، درحقیقت تعلیمات اسلام اعتدال کا دوسرا نام ہے۔

۱۔ بخاری: کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح

اسلام انسانوں کو نہ تو فرشتہ بننے پر مجبور کرتا ہے اور نہ وہ ان کا شیطان بننا گوارہ کرتا ہے، بل کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے دائرے میں رہ کر زندگی گزارے اور یہی اس کا کمال ہے، وہ کھانا پینا بھی نہ چھوڑے اور روزے بھی رکھے، اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرے اور راحت و آرام بھی، شادی کرکے جنسی میلان بھی پورا کرے، مگر عفت وعصمت کی حفاظت کے وقت فرشتہ بھی بن جائے، گویا وہ ایک ایسا انسان ہو جس کے اندر ملکوتی صفات بھی ہوں اور انسانی اوصاف بھی، یہ بات انسانی مجد وشرف کے خلاف ہے کہ وہ اپنے دامن عفت کو آلودہ ہوتے ہوئے دیکھ کر برداشت کرے، جنسی میلان کی تکمیل اگر انسان کا پیدائشی حق ہے تو اسی کے ساتھ ناجائز طریقوں سے اجتناب اس کا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے۔(۱)

روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر معاملے میں اعتدال اور میانہ روی پسند تھی، مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں ایک جانب فاقہ کشی، سادگی، قناعت اور زہد جیسی صفات سے فطری رغبت تھی، آپ دنیا اور دنیاوی لوازم سے حتی الامکان گریز اور اعراض فرماتے تھے، اور اس کے ثبوت میں وہ بے شمار واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جو کتب سیرت وحدیث میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تقشف اور رہبانیت جیسی صفات سخت ناپسند تھیں، اور جائز اور حلال چیزیں جو درست طریقے سے حاصل کی گئی ہوں ان کے استعمال کو پسند فرماتے تھے، اور ان سے فائدہ اٹھانے کو مستحسن قرار دیتے تھے، اپنے آپ کو بلاوجہ مشقت میں ڈالنے اور بلاضرورت حلال چیزوں سے اجتناب اور اعراض کو کبھی پسند نہیں فرمایا، سطور بالا میں بیان ہونے والے واقعے میں اسی کا درس دیا گیا ہے کہ دین یہ نہیں ہے کہ اپنا مرضی سے اپنے اوپر سختیاں لازم کرلی جائیں بل کہ دین تو اللہ اور اس کے رسول کے احکامات پر چلنے کا نام ہے، اور اس سلسلے میں سب سے بہترین رہ نمائی خود جناب نبیٔ کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ سے مل سکتی ہے، جس کی جانب قرآن نے بھی متوجہ کیا اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے قول وفعل کے ذریعے اس جانب توجہ دلائی ہے۔

افراط وتفریط سے بچنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ زندگی کا

۱۔ مولانا ظفیر الدین مفتاحی۔ اسلام کا نظامِ امن: ص ۳۴۷

کوئی شعبہ اس سے خالی نہیں، جیسا کہ عرض کیا گیا رہبانیت اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا رہبانیة فی الاسلام (۱)

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

وہ لوازم زیست کو برتنے سے منع نہیں کرتا، ان کی حدود اور میعاد و مقدار متعین کرتا ہے، وہ نہ تو ان ضرورتوں کا سرے سے انکار کرتا ہے، نہ ان میں سرتاپا غرق ہوجانے کو روا رکھتا ہے، اس کا طریقہ افراط وتفریط کی دونوں حدوں کے مابین ہے، اسی کو اعتدال کہتے ہیں۔

کسی غزوے کے موقع پر ایک صحابیؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک غار پر ہوا، جس کے قریب پانی بھی موجود تھا اور اس کے پاس سبزہ بھی اگا ہوا تھا، انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ایک ایسا غار مل گیا ہے، جس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں، میری خواہش ہے کہ میں وہاں گوشہ نشین ہو کر دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا، اور فرمایا:

انی لم ابعث بالیهودیة ولا بالنصرانیة، ولکنی بعثت بالحنیفیة السمحة (۲)

میں یہودیت ونصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا، میں تو آسان اور سہل دین ابراہیمی لے کر آیا ہوں۔

ہمارے ہاں افراط وتفریط کے مظاہر ہر مقام پر عام ہیں، ملنے جلنے سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک اور کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے تک ہر معاملے میں افراط وتفریط نے ہمیں اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے، اسلام کا پیغام اعتدال انسانی معاشرت کے ہر پہلو کے لیے ہے، مثال کے طور پر وہ ایک جانب تو صاف رہنے کی تلقین کرتا ہے، چناں چہ فرمان نبوت ہے:

الطهور شطر الایمان (۳)

۱۔ فتح الباری: ج۹ص۱۱۱

۲۔ احمد: ج۶ص۳۵۷، رقم ۲۱۷۸۸

۳۔ مسلم: ج۱ص۱۷۱۔ رقم ۲۲۳

صفائی ایمان کا حصہ ہے۔

اور ایک دوسرے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بنى الدين على النظافة (۱)

دین کی بنیاد صفائی ستھرائی پر رکھی گئی ہے۔

دوسری جانب وہ اچھا اور حیثیت کے مطابق لباس پہننے کی بھی تاکید کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اسراف اور فضول خرچی، دکھلاوے اور ریاکاری اور نمود و نمائش سب کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

آج پوری دنیا کی معاشرت لباس و پوشاک کے ایک طوفان میں مبتلا ہے، قسم قسم کے لباسوں کی بھرمار ہے۔ تقاریب کے فرق سے، موسموں کے تفاوت سے، مقامات کی تبدیلی کے اعتبار سے، اور اوقات کی تخصیص کے ساتھ لباس تبدیل ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ برائیاں تو مغرب سے ہمارے ہاں آئی ہیں اور کچھ ہم نے خود تخلیق کی اور پروان چڑھائی ہیں۔

شادی بیاہ کو ہی دیکھ لیجیے، ایک شادی کے لیے دس طرح کی تقاریب ضروری ہیں، جو بجائے خود اسراف کا نمونہ اور اسلامی مزاج کے خلاف ہیں، پھر خصوصاً خواتین کے لیے ان میں شرکت کی خاطر ہر تقریب کا نیا جوڑا درکار ہوتا ہے، جسے اسراف کی بدترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے، اور یہ راہ راہِ اعتدال تو قطعاً نہیں۔

افراط وتفریط کے مابین اسلام کی تجویز کردہ راہ یہی ہے کہ ہر ایک کے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھتے ہوئے حقوق اللہ کی ادائیگی کو پیش نظر رکھیں، اور حقوق اللہ صرف پانچ وقت نماز پڑھنے اور رمضان میں روزے رکھنے کا ہی نام نہیں، اخلاقیات، معاملات اور معاشرت کے حوالے سے جو ہدایات، تعلیمات اور احکامات ہمیں دیے گئے ہیں، ان کی بجا آوری بھی دین کا ناگزیر حصہ اور حقوق اللہ میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ راہ عمل آسان فرمائے، آمین۔

۱۔ قاضی عیاض۔ الشفاء: ج۱ص ۳۹

جہالت کا مقابلہ

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا اور ان کی دل آزاری کی، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خاموش رہے، اس شخص نے پھر ایسی ہی بات کہی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پھر بھی خاموش رہے، تیسری مرتبہ جب پھر اس شخص نے انہیں تکلیف پہنچائی تو انہوں نے اس کا جواب دے دیا، یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا آپ ناراض ہو گئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں، بل کہ جب وہ شخص تمہیں برا بھلا کہہ رہا تھا تو آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا تھا، جو اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا، مگر جب تم نے اس کا جواب دینا شروع کیا تو وہ فرشتہ چلا گیا اور شیطان آ کر بیٹھ گیا، اور میں ایسی جگہ پر نہیں بیٹھ سکتا جہاں شیطان ہو۔ (۱)

حقیقت یہ ہے کہ ہر بات اس قابل ہوتی بھی نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے، یہی بات کسی عمل کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے کہ ہر عمل بھی اس کا قابل نہیں ہوتا کہ اس پر کسی ردعمل کا اظہار کیا جائے، اس واقعے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تلقین فرمائی ہے۔

قرآن حکیم میں بھی اللہ کے بندوں کی علامات اور صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ

۱۔ ابوداؤد

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝ (۱)

رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال سے چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرنا چاہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم پر سلام، (اور یہ کہہ کر ان سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں)۔

انسان کو اگر اس کے مزاج کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جائے تو ایک گروہ ایسا ملتا ہے جو زندگی بھر ترش رو، تند خو اور بدگو رہتا ہے، بات بات پر گالم گلوچ، لمحہ بھر میں تلخ روئی اور ہر ایک سے تیوری پر بل چڑھا کر ملنا ان کے مزاج کا وطیرہ ہوتا ہے، بہ رحال یہ ایک ایسی جنس ہے جو پائی جاتی ہے، لہٰذا اس سے نہ صرف کسی کا بھی واسطہ پڑ سکتا ہے، بل کہ اس سے نمٹنا بھی ضروری ہے۔

سطورِ بالا میں اسی نوع کے افراد سے ملنے بل کہ اعراض کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا گیا ہے کہ جاہلوں کا اور ان کی جہالت کا جواب خاموشی کے سوا کچھ نہیں، ہر بات اس لیے نہیں کی جاتی کہ اس کا جواب بھی دیا جائے، اور نہ ہر بات کا جواب ہی ہوتا ہے، جہالت اور جاہلانہ اسلوب گفت گو کا بھی کوئی جواب نہیں، سوائے خاموشی کے۔

یہ طریقۂ کار اس لیے بھی ضروری ہے کہ بداخلاقی کے مقابلے میں اگر کوئی معقول انسان خود بھی بداخلاقی پر اتر آئے تو سوچنے کا مقام ہے کہ اس میں نقصان کس کا ہوا؟ جو شخص آپ کو اپنے قول و فعل کے ذریعے اس غلطی پر آمادہ کر رہا ہے وہ تو پہلے ہی آپ کا ''ہم جنس'' نہیں، وہ تو دولتِ اخلاق سے پہلے ہی کوئی علاقہ نہیں رکھتا، کیا ایک ایسے شخص کے لیے آپ بھی اپنی دولت گنوا دینا چاہتے ہیں؟

اور پھر اس سے بات کرنا کیا آپ کے لیے اس قدر اہم ہے کہ آپ اپنی بلندیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اور اپنی رفعتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کے پست مقام پر اتر جانا چاہتے ہیں؟ یقیناً یہ ہمارے لیے غور و فکر کا مقام ہے، قرآن حکیم نے اس مسئلے پر ایک اور انداز اور پہلو سے بھی توجہ دلائی ہے۔

۱۔ الفرقان: ۶۳

سورۂ مؤمنون کے آغاز میں فلاح یاب ہو جانے والے مومنوں کی صفات اور خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ (۱)

بلاشبہ کام یاب ہو گئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں اور لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

یہاں نماز میں خشوع، للّٰہیت اور خوفِ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر اہل ایمان اور کام یاب ہونے والے مومنوں کی صفت لغویات سے اعراض کی بیان کی ہے، ہر طرح کی لغویات سے منہ موڑ لینا، اس سے اپنے آپ کو باز رکھنا اور اس سے بچتے ہوئے کار آمد، مفید اور تعمیری سرگرمیوں میں اپنے آپ کو مصروف رکھنا یہ اہل ایمان کی علامت ہے، لہٰذا لغویات کا شکار ہو جانے والے ایمانِ کامل نہیں رکھتے، اور فضول، لایعنی بل کہ جھگڑے و فساد کا باعث بننے والی گفت گو سے بڑھ کر اور لغویات کیا ہو گی؟

قرآن و سنت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جاہلانہ باتوں سے اعراض کرنے، اپنے کام سے کام رکھنے، اپنی صلاحیتوں کو مثبت اقدامات میں صرف کرنے اور مخالفتوں کا جواب نرمی اور بھلائی سے دینے کی ایک مسلمان کی زندگی میں کس قدر اہمیت ہے؟ ایک مقام پر قرآن حکیم میں فرمایا:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝۹۶ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝۹۷ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝۹۸ (۲)

آپ (ا) برائی کو ایسے برتاؤ سے دور کیجیے جو سراسر اچھا ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ (آپ کے بارے میں) بیان کرتے ہیں۔ اور آپ دعا کیجیے کہ اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے

۱۔ المومنون: ۱۔۳

۲۔ المومنون: ۹۶۔۹۸

میرے رب میں اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ (شیاطین) میرے پاس آئیں۔

قرآنِ حکیم نے تو صبر کو اور جاہلانہ باتوں سے اعراض کو اولوالعزم انبیا کی صفت قرار دیا ہے۔ فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (۱)

اور برداشت کرو جیسا کہ اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو اعلیٰ و ارفع منصب و مقام دے کر اس کائنات میں بھیجا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ سطحی اور بے فائدہ امور سے مکمل طور پر مجتنب رہے، اس کی تخلیق جن مقاصد کے لیے ہوئی ہے، ان کی راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو گرا دینا اسلام کا ایک اہم مقصد ہے، وہ قطعاً یہ نہیں چاہتا کہ لغویات میں پڑ کر انسان اپنی محدود اور چند روزہ زندگی برباد کرے اور پھر ندامت اور ہمیشہ کی پشیمانی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔

آج ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو جہاں ایک جانب لغویات کا سیلاب نظر آتا ہے، وہیں ایسی جہالت بھی مسلسل پلتی، پھیلتی اور پھولتی نظر آتی ہے جس کے جواب میں قرآن نے **سلاما** کہہ کر آگے بڑھ جانے اور اس سے مکمل اعراض کا تلقین کی ہے اور نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے جواب میں خاموش کی تعلیم دی ہے، مگر ہم نہ صرف یہ کہ عموماً ان مظاہر جہالت سے اپنے آپ کو بچانے میں کام یاب نہیں ہو پاتے، بل کہ اکثر آگے بڑھ کر اور لپک کر اس سے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں، نتیجہ ظاہر ہے کہ ان جہالتوں کے دامن سے وابستہ چنگاریاں ہمارے کپڑوں پر بھی پڑتی ہیں، بل کہ بعض اوقات اچھا خاصا نشیمن بھی لمحوں میں جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔

ملازمت ہو یا تجارت یا کوئی اور شعبہ، ہر اس بات سے اعراض اور پرہیز خود ہمارے لیے فائدہ مند ہے جس سے ہمارا کوئی دینی یا دنیاوی مفاد وابستہ نہ ہو، لیکن مشاہدہ یہی ہے کہ اس بدیہی اور عالم گیر حقیقت سے عدم واقفیت یا کم از کم عملی اعتبار سے لاپروائی عام ہے، ورنہ

۱۔ الاحقاف: ۳۵

سونے سے زیادہ قیمتی وقت کے ضیاع کا باعث بننے والے طرح طرح کے کلب، بازار کی دکانیں، محلوں کے تھڑے، دیہاتوں کے چوپال، وڈیروں کے ڈیرے اور سرداروں کے درباریوں آباد نہ ہوتے، جن کی آبادی ہمیں صلاحیتوں، وقت اور دولت تینوں کی بربادی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

اعراض کی ضرورت

بنی مالک بن کنانہ کے ایک شخص سے امام احمدؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے سوق ذی المجاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے تھے:

یاایہا الناس، قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا

اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہہ دو، کامیاب ہو جاؤ گے۔

راوی کہتے ہیں کہ ابوجہل بھی آپ کے ساتھ ساتھ تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی پھینکتا جاتا تھا، اور یہ کہتا جاتا تھا:

لوگو! یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ نہ کر دے، اس کی تو خواہش (اور کوشش) یہ ہے کہ تم اپنے معبدوں کو چھوڑ دو، اور لات وعزیٰ (کی پرستش) کو ترک کر دو۔

لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جانب توجہ ہی نہ فرماتے تھے۔ (۱)

یہ واقعہ سیرت طیبہ کا ایک اہم واقعہ ہے، مگر آج کی نشست میں ہماری دلچسپی کا باعث راوی کا یہ جملہ ہے:

وما یلتفت الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (ابوجہل) کی جانب توجہ ہی نہ فرماتے تھے۔

جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعوت اسلام کا آغاز فرمایا تو آپ کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پوری انسانیت کے لیے زندگی بخش اور حیات نو کی نوید

۱۔ احمد: ج ۱، ص ۱۰۸

تھا۔لیکن وہ اتنا عظیم الشان اوراس دور میں مروج رسوم و روایات سے اس قدر ہٹ کر تھا کہ عوام کی اکثریت اس کی حقانیت کو فوری طور پر سمجھ ہی نہ سکی، پھر دوسرے کئی ایک عوامل بھی موجود تھے جو ان کے دعوت اسلام کو قبول کرنے میں مانع ہوئے، اس بنا پر آپ ﷺ کی مخالفت پر پوری تحریک برپا ہوگئی۔ یہ حالات ایسے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقائے کار کو بیک وقت کئی محاذوں پر کام کرنا پڑا، لیکن آپ ﷺ کی اصل دل چسپی کا محور یہی ایک پیغام رہا:

قولو الا الٰہ اللہ تفلحوا

کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کامیاب ہو جاؤ گے۔

بعض موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفاعی اقدامات پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ اپنی بقا کی جدوجہد بھی کرنی پڑی، لیکن آپ ﷺ کی اصل توجہ کارِ نبوت پر ہی مرتکز رہی، اس بات میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں بھی ہمارے لیے ایک جہانِ عبرت اور درسِ حکمت پوشیدہ ہے۔

اس واقعے سے پہلا مفہوم یہی اخذ ہوتا ہے کہ انسان جب کسی بڑے کام کو اپنا اولین مقصد قرار دے لیتا ہے تو اس کے سامنے معمولی اور سطحی نوعیت کی باتیں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں، اس کا مزاج از خود انہیں نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے، جو جب کسی بڑے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو راستے کے معمولی کنکر اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، اس کی تو نظر سنگِ میل سے کہیں آگے منزل پر ہوتی ہے۔

اس واقعے میں اس طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ بڑے کام کے کرنے والوں کو رکاوٹیں ضرور پیش آتی ہیں، اور وہ رکاوٹیں ان کی توجہ تقسیم کر سکتی ہیں، لیکن صحیح معنیٰ میں جس کی اپنے مقصد سے وابستگی ہوتی ہے اس کی توجہ تقسیم نہیں ہو سکتی۔

اس واقعے میں یہ درس بھی پوشیدہ ہے کہ ان حالات میں جب انسان کی توجہ اپنے اعلیٰ مقاصد سے ہٹنے لگے تو امکانی حد تک کوشش یہ ہونی چاہیے کہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے تمام واقعات اور حادثات کو انسان نظر انداز کرتے ہوئے آگے کی جانب اور اپنی منزل کی سمت میں اپنے سفر جاری رکھے، اور رکاوٹ بننے والی قوتوں سے اعراض اور کنارہ کشی

کا رویہ اختیار کرے۔

قرآن حکیم نے بھی ہمیں یہی تلقین کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ (۱)

اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں (اور اعراض کرلیں)

دین حق کی راہ میں رکاوٹ بننے والی قوتوں کا یہ رویہ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے عہد مبارک کے ساتھ ہی نہ تھا، ان کا یہ رویہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سے چلا آرہا ہے اور شکلوں، صورتوں، رویوں اور طریقۂ کار کی تبدیلی کے ساتھ آج بھی جاری ہے، جب کبھی بھی، کسی جانب سے بھی کوئی اچھی آواز بلند ہوتی ہے تو اس کو دبانے کے لیے کوئی نہ کوئی چلا اٹھتا رہے، کوئی نہ کوئی لوگوں کو اس آواز سے دور کرنے کی سعی کوشش شروع کر دیتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں اکثر اوقات دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ اچھی آواز بلند کرنے والے اپنی توجہ کا ارتکاز کھو بیٹھتے ہیں، ان کی توجہ منتشر اور ان کی مساعی تقسیم ہو جاتی ہیں، یہی بات آگے چل کر ناکامی کی بنیاد بنتی ہے، مخالفت کرنے والوں اور رکاوٹیں کھڑی کرنے والوں کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو صلاحیت بھی دی گئی ہے اس کا ایک مقصد بھی ہے اور مصرف بھی، اگر اس صلاحیت کا استعمال اس کے صحیح مقصد سے ہٹ کر کہیں پر کیا جائے تو یہ حد سے تجاویز کہلائے گا، اور حد سے تجاویز کرنے والے اپنے کام سے انصاف نہیں کر سکتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا صرف یہی ایک واقعہ ہمیں یہ سبق نہیں دیتا بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بہت سے واقعات اس امر کی جانب ہماری رہ نمائی کرتے ہیں، صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی ہمارے لیے اس حوالے سے سبق آموز ہے، آپ صلی اللہ علیہ کے سامنے کفار مکہ نے بہت سی شرائط رکھیں، جن میں یہ بات بھی شامل تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس سال عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں، اور اگلے سال بغیر ہتھیاروں کے اس مقصد کے لیے آئیں۔ قریش کا جو شخص اپنے ولی یا آقا کی اجازت کے بغیر بھاگ کر مدینہ

۱۔ الفرقان: ۶۳

منورہ جائے گا اس کو واپس کیا جائے گا، اگرچہ وہ مسلمان ہو کر جائے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس مکہ مکرمہ چلا جائے گا۔ اس کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ جو مسلمان پہلے سے مکے میں مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو روکا نہ جائے۔ وغیرہ (۱)

ظاہر ہے کہ یہ شرائط مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبول فرمالیا، اور ان کے نانا روا سے ناروا باتوں کو بھی خوش دلی سے قبول کیا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ان چیزوں پر تھی، جو دوسروں کی نگاہ سے اوجھل تھیں، آپ جانتے تھے کہ اس صلح کے نتیجے میں پیغام رسالت کی تبلیغ اور اسلام کی دعوت کی ترویج کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہو سکیں گی، اور وہ تمام مشکلات جو اس راستے میں موجود ہیں ختم ہو جائے گی، چناں چہ یہی ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ''اعراض'' کے نتیجے میں وہ برکت ہوئی کہ اسلام کا پیغام چند ہی برسوں کی محنت سے پورے جزیۃ العرب کے چپے چپے پر پھیل گیا، اور اس سے باہر بھی اسلام کی صدائیں گونجنے لگیں۔

اس بنا پر ہمارے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ اپنی ترجیحات کی تعیین کے بعد ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں سے مسلسل اور مکمل اعراض اور صرف نظر کرتے ہوئے اپنے اصل مقصد کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھیں۔ کسی بھی رکاوٹ سے الجھنا ایک تو ہمارے سفر کی مدت میں اضافہ کر دے گا، دوسرے ہماری صلاحیتوں کو بھی کم کرے گا۔ سیرت طیبہ کا یہ نکتہ ہمیں بہت سی مشکلات سے نجات دے سکتا ہے، اور بہت سے مصائب سے بچا سکتا ہے، اگر ہم اس پر غور و فکر کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں فکر صحیح اور عقل سلیم عطا فرمائے آمین۔

۱۔ سیرت ابن کثیر: ج ۳، ص ۳۲۲

مخالفین

نبیٔ کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی دعوت کا ابتدائی زمانہ ہے، مشکل بڑھتی جارہی ہیں۔ جوں جوں لوگ اسلام کے قریب ہورہے ہیں، اسی رفتار سے قریش کی تشویش میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوتِ توحید کے آگے بند باندھنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں، تشدد کا راستہ بھی چنا جاتا ہے۔ مسلمان تشدد برداشت کرتے ہیں، مظالم سہتے ہیں، زخمی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ شہید تک ہوجاتے ہیں، مگر وہ اپنے موقف سے ذرا پیچھے نہیں ہٹتے۔ اسلام کی دعوت پھیلتی رہتی ہے، کارواں مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے، اور سفر جاری رہتا ہے۔ مگر جب کچھ بھی کارگر نہیں ہوتا تو مشرکین مکہ بات چیت کا سلسلہ شروع کرتے ہیں، مذکرات کے کئی دور گزرتے ہیں مگر یہ مذاکرات بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو پاتے، جو کچھ قریش چاہتے ہیں وہ ماننے کی چیز ہی نہیں۔ اور جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، وہ انہیں سمجھ میں نہیں آتا۔

قریش مکہ ایک بار پھر صورت حال پر غور کرتے ہیں، اس سلسلے میں قریش کے لوگ ایک بار پھر جمع ہوتے ہیں۔ اس بار انھوں نے حصین بن منذر حزاعی کو جو جلیل القدر صحابی عمران بن حصین کے والد تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مناظرے کے لیے تیار کیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آیا، آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اور صحابۂ کرام اردگرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ حصین بن منذر نے آتے ہی قریش کی روایتی زبان میں وہی پرانے، باربار کے دہرائے ہوئے گھسے پٹے اعتراضات ایک بار پھر دہرانا شروع کیے کہ تم نے ہمارا شیرازہ بکھیر دیا اور ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی سے سنتے رہے۔ اس نے اپنی بات ختم کی تو آپ نہایت

احترام سے بولے:

آپ اپنی بات کر چکے؟

اس نے کہا: ہاں

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اب میں آپ سے چند سوالات کرتا ہوں، آپ ان کا جواب دیجیے۔

اس نے کہا: اچھا پوچھو، میں سن رہا ہوں۔

آپ نے پہلا سوال کیا:

آج کل آپ کتنے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں؟

وہ بولا: سات خداؤں کی، چھ زمین میں ہیں اور ایک آسمان میں۔

آپ ان میں سے کس خدا سے مرادیں مانگتے اور ڈرتے ہیں۔

اس خدا سے جو آسمان میں ہے۔

حصین! اگر آپ اسلام لے آئیں تو میں آپ کو دو ایسے کلمے سکھاؤں گا جو آپ کو فائدہ دیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نرمی سے کہا۔

حصین فوراً مسلمان ہو گئے اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! مجھے وہ دو کلمے سکھا دیجیے جن کا آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قل اللّٰھم الھمنی رشدی واعذنی من شر نفسی (۱)

آپ کہا کیجیے: اے اللہ! میرے دل میں رشد و ہدایت ڈال دے اور مجھے میرے نفس کے شر سے بچا۔

مخالفت کی شدت دیکھیے، مگر سادگی اور نیت کی صفائی بھی ملاحظہ کیجیے، کہاں تو لڑنے اور باتوں کے میدان میں ہرانے کی غرض سے آئے تھے اور کہاں اپنا سب کچھ ہار کر جا رہے ہیں۔

۱۔ ترمذی: ۳۴۸۳

سبحان اللہ

مگر یہ سب کیوں کر ممکن ہو سکا؟ اس قصے میں سب سے اہم سوال یہی ہے۔

مخالفت تو مخالف کا وظیفہ ہے، اس کو یہ کام انجام دینا ہی ہے، سوال یہ ہے کہ ہم اگر اپنی زندگی کا کوئی مقصد رکھتے ہیں تو کیا اسے محض مخالفین کے ردعمل میں برباد کر دیا جائے؟ یا اس سے بہتر یہ ہوگا کہ ہم مخالف کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت سے اپنی حمایت کشید کرنے کی کوشش کریں۔

اس واقعے میں اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

جذبات کا معاملہ

غزوۂ احد اپنی شدت اور سختی کی بنا پر ایک تاریخی غزوہ ہے۔ یہ غزوہ کئی ایک اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے، خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر کہ یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ اسی غزوے کا مشہور واقعہ ہے کہ جب یہ غزوہ اپنے جوبن پر تھا اور معرکۂ حق و باطل بپا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور کہا کہ کون اس تلوار کا حق ادا کرے گا؟ چند صحابۂ کرام آپ کی طرف بڑھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تلوار نہیں دی، پھر حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ سامنے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس تلوار کا حق کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے دشمن کو مارو، یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کردو، ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ قبول کرتا ہوں، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تلوار عنایت کردی، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے تلوار تھامی اور چل پڑے، انہوں نے اپنے سر پر سرخ رنگ کی پگڑی باندھی اور موت سے نڈر ہوکر جنگ میں کود پڑے، وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑتے اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے رہے۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں:

> میں نے ایک شخص کو دیکھا وہ بری طرح لوگوں کو جنگ پر ابھار رہا تھا، میں اس کی طرف لپکا، جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو میں نے اس کی آواز سنی کہ ''ہائے تباہی'' تب مجھے علم ہوا کہ یہ تو کوئی عورت ہے۔ اس وقت (میرا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اور) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کو کسی عورت کے خون سے پاک

رکھا۔(۱)

وہ عورت ہند بنت عقبہ تھی اور اس وقت ایک اور صحابی رسول کے بہ قول ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی تلوار اس کے سر پر اٹھ چکی تھی، مگر پھر انہوں نے تلوار ہٹائی، اگر غور کیا جائے تو وہ وقت بڑا ہی نازک تھا، ایسے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ہدایت اور حکم کا ذہن میں رہنا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل مت کرو، بہ جائے خود ایک اہم واقعہ اور زندہ کرامت ہے۔ پھر بڑھی ہوئی تلوار کو نیام میں واپس کر لینا اور ایک ایسے موقع پر جب تلوار خون چاٹ چکی ہو، سامنے مذہب اور جان کے دشمنوں کا لشکر ہو، جو تہیہ ہی یہ کر کے آیا ہو کہ آج مسلمانوں کا قصہ پاک کر کے دم لینا ہے، عام حالات میں سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، اس بات کی اہمیت اور حقیقت محض محسوس ہی کی جا سکتی ہے۔

اس قصے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کس قدر کامیاب تھی اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے جذبات پر کس قدر قابو تھا، ان کے اعمال و افعال اسلامی تعلیمات کے ماتحت تھے اور ان کے شعور میں اسلام اور اسلامی احکام پوری طرح راسخ ہو چکے تھے۔ ذاتی جذبات کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی تھی، وہ انتہائی اشتعال کے موقع پر بھی نہایت صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ فیصلہ کرنے کی پوری قدرت رکھتے تھے، وہ غصے اور انتقام کے مواقع پر بھی اسلامی ہدایات کو اولین ترجیح دینے پر پوری طرح قادر تھے، یہی ان کے ایمان کی سب سے بڑی خوبی تھی اور یہی کردار کو پرکھنے کی سب سے اہم کسوٹی ہے۔

اسلام کسی کے جذبات، احساسات، خواہشات اور ذاتی فہم و ارادے کا نام نہیں، محض اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور ارشادات کا نام ہے، اگر کوئی ان ارشادات و احکام کے ذیل میں آتا ہے تو وہ شریعت کی نگاہ میں درست ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

جو فعل اور عمل ذاتی احساسات اور جذبات کے ماتحت صادر ہوا ہو، وہ چاہے مسلمان

۱۔ سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۵۲

سے صادر ہو یا غیر مسلم سے، اس کا کرنے والا خواہ دین دار ہو یا دنیا دار، اس کی شریعت میں نہ کوئی اصل ہے، نہ کوئی حقیقت، وہ انسان کے دیگر افعال کی مانند ایک فعل ہے۔ اگر وہ فی نفسہ مباح ہوگا تو اس کے مباح اور جائز ہونے کا حکم ہوگا اگر وہ فی ذاتہ غلط ہوگا تو اس کے غلط ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

شریعت کا حکم اور تقاضا یہ ہے کہ انسان سر سے پاؤں تک اس کے احکام کی پابندی کرے، اس میں انسانی احساسات و جذبات بھی شامل ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوۃ یہ تمام ارکان اسی لیے فرض کیے گئے کہ انسان اپنے احساسات کو شریعت کے احکام پر قربان کرنے کا ادب سیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے کہ اصل چیز خدا اور رسول خدا کا حکم ہے، نہ کہ ذاتی جذبات و خیالات، یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو فہم شریعت کی بنیاد کہلا سکتا ہے، اگر یہ نکتہ فراموش کر دیا جائے تو پھر شریعت کا صرف نام رہ جائے گا اور ذاتی جذبات واحساسات، اس پر غلبہ پالیں گے۔ اعاذنا اللہ منہ

غصے کا اظہار

زید بن سعفہ رضی اللہ عنہ ایک معروف صحابی ہیں، ان کے اسلام لانے سے قبل کا واقعہ ہے، یہ لین دین کا کاروبار کرتے تھے، اس دور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، قرض کی ادائیگی کی مدت ابھی باقی تھی کہ انہوں نے آ کر تقاضا کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک کھینچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سست کہا اور کہنے لگا کہ عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی کرتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصے سے بے تاب ہو گئے اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اے دشمن خدا! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟

لیکن اس قدر سخت موقع پر اور حضرت زید کی جانب سے مکمل اشتعال انگیزی کے باجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل غصے نہیں ہوئے اور ایک یہودی کی گستاخی کو کمال تحمل اور حد درجے اطمینان کے ساتھ برداشت کیا اور انہیں کچھ کہنے کی بہ جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے تم سے یہ امید تھی کہ تم اسے سمجھاؤ گے تم نرمی سے تقاضا کرو اور مجھے کہتے کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں اور پھر ان سے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کر کے انہیں بیس صاع کھجور زائد ادا کرو۔ (۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حسن سلوک ہر ایک کے ساتھ عام تھا، ان میں عام دیہاتی لوگوں کے ساتھ منافقین، مشرکین یہودی اور آپ کے اعزہ واقارب سمیت آپ کے ساتھیوں کے قاتل اور آپ کے جان کے دشمن سبھی شامل تھے۔

۱۔ سیرت النبی: ج ۲، ص ۲۱۶

ایک بدوی کا قصہ حدیث کی کتب میں معروف ہے، ایک مرتبہ ایک دیہاتی شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر نہایت گستاخی سے سوال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک کو کھینچا، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک پر نشان پڑ گیا اور آپ کی گردن سرخ ہو گئی پھر وہ کہنے لگا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، اسے میرے ان دو اونٹوں پر لاد دے، اس دیہاتی کے اس قدر گستاخانہ اسلوب اور طرز عمل پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل غصے نہیں ہوئے بل کہ آپ نے تین بار استغفار پڑھا اور پھر اس کو بلایا اور اس کے لیے یہ ہدایت فرمائی:

احمل له علی بعیریه ہذین، علی بعیر شعیر أو علی الآخر تمراً

اس کے لیے ایک اونٹ پر جو، اور دوسرے اونٹ پر کھجور لاد دے جائیں۔

اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر اسے رخصت کرتے ہوئے فرمایا:

انصرفوا علی برکۃ اللہ (۱)

اللہ کی برکت کے ساتھ رخصت ہو جا۔

یہ حقیقت ہے کہ اشتعال انگیزی اور ایسے اقدامات جن سے انسان کے اندر غصے اور رد عمل کے جذبات ابھر آتے ہیں، انسان کو معتدل نہیں رہنے دیتے، لیکن ایسے مواقع پر ہی فی الحقیقت انسان کی اصل شخصیت سامنے آتی ہے، غصہ اپنی اصل کے اعتبار سے مکمل طور پر کوئی مذموم عمل نہیں ہے، اسی لیے ممنوع بھی نہیں۔ لیکن اس کے کچھ مواقع ہیں اور ان مواقع پر بھی اس کے اظہار کے کچھ آداب ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ جب ایسے مواقع پر غصے کا اظہار سے صرف اپنے نفس کی تسکین مقصود ہو تو اس وقت عفو اور در گذر سے کام لینا اور معاف کر دینا ہی پسندیدہ ہے، یہی قرآن کا حکم ہے اور یہی رسول رحمت علیہ الصلاۃ والتسلیم کی تعلیمات ہیں، اور اگر راہ عزیمت کو ترک کرتے ہوئے رخصت پر عمل کرنا ہو تب بھی صرف اس حد تک غصے کا اظہار کیا جا سکتا ہے اور بدلہ لیا جا سکتا ہے، جس قدر فریق مخالف کا جرم تھا، اس سے زیادہ کرنا حد سے تجاوز کہلائے گا اور ظلم میں داخل ہو گا۔

۱۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۲۶۳، رقم ۴۷۷۵

دوسری بات یہ ہے کہ اگر دین کا معاملہ ہو تو غصے کا اظہار مشروع بھی ہے اور محمود بھی، لیکن اس کے لیے ہر شخص کی حدود متعین ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی معاملات میں اسوۂ حسنہ کیا تھا؟ یہ سامنے آچکا ہے، آپ دینی معاملات میں کیا طریقۂ کار اختیار فرماتے تھے، اس کا ذکر ایک اور روایت میں ہے، جس میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملے میں کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا ہاں جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا تو اس سے اللہ ہی کے لیے بدلہ لیا۔

اس لیے دین کے معاملے میں غصے کا اظہار ممنوع نہیں لیکن چند شرائط کے ساتھ اس کی اجازت مشروط ہے۔ ایک تو ہر شخص صرف اپنے معاملات کا مکلف ہے، دوسرے ان حضرات کا جو کسی بھی درجے میں اس کے ماتحت ہیں، یا اس کی نگرانی میں دیے گئے ہیں، دوسروں کی حدود کار میں مداخلت کسی بھی عنوان کے تحت نہیں کی جاسکتی، اس کے لیے دوسرا طریقۂ کار ہے، وہ ہے مناسب انداز میں، مناسب وقت پر سمجھانا اور اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنی راہیں الگ کرلینا۔

درحقیقت غصے کے اظہار کے حوالے سے انسانی کیفیات میں بڑا فرق ہے اور اس میں لوگوں کے نرم وگرم سنجیدہ وجلد باز اور پاکیزہ وبدکردار ہونے میں ان کی اصل فطرت اور ان کے طبعی مزاج کا بڑا دخل ہے، اس کے ساتھ ساتھ انسان کی اپنی خود اعتمادی اور مزاج کی استقامت بھی اس معاملے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، صحیح معنیٰ میں بڑا آدمی جس قدر اخلاق و کمال سے آراستہ ہوگا، اسی قدر اس کا قلب کشادگی کا حامل اور اس کا دامن حلم و بردباری کے اعتبار سے وسعتیں رکھتا ہوگا، وہ لوگوں کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرے گا اور ان کی بے گناہی کا پرچار کرے گا اور ان کی جانب سے معذرت کرنے پر اسے قبول کرنے میں تامل نہیں کرے گا اور اگر کوئی اس کی نرم طبیعت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا تو اسے نادان بچہ تصور کر کے اس سے صرف نظر کرے گا۔

انسانی کردار کی عظمت کا بہت بڑا حصہ غصے کے وقت ہی ظاہر ہوتا ہے، اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شخص بہ حیثیت انسان کس مقام پر فائز ہے؟ اور اس کا مقام کس قدر بلندی کا حامل ہے؟ اسی طرح اس مسئلے کا تعلق کینہ پروری سے بھی ہے۔ یہ انسان اگر کردار کا پختہ اور اخلاق

کی بلندی کا حامل نہیں ہے تو اگر وہ وقتی طور پر کسی بھی جذبے کے تحت عفوودرگزر سے کام لے بھی لے تب بھی وہ مستقبل میں کسی ایسے امکان کا متلاشی رہے گا، جب وہ مخالف فریق کو گزند پہنچا کر اپنی جھوٹی انا کی تسکین کر سکے، یہ سوچ یقیناً بہت ہی پستی کی حامل ہے، اسی لیے اسلام اس سے سختی سے منع کرتا ہے۔

عفوودرگزر کی صفات ایسی مطلوب صفات ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مومنوں کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس صفت کو اپنا کر عفواور درگزر کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (۱)

ان کو چاہیے کہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ لوگوں کو باہم متحد دیکھنا چاہتا ہے اور تقسیم در تقسیم کا قطعاً روادار نہیں، اسی لیے وہ ہر اس رخنے کو پرے کر دیتا ہے جہاں سے اس انسانی اتحاد کو ذرا بھی نقصان پہنچنے کا خدشہ موجود ہو اور غصہ اس اتحاد کو نقصان پہنچانے والا ایک اہم عنصر ہے، اس لیے اسے اسلام کسی طور بھی برداشت نہیں کر سکتا، سوائے چند استثنائی صورتوں کے جن کا ذکر ماقبل میں گزر چکا۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابۂ کرامؓ سے پوچھا کہ تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ اور صحابہ نے جواب میں عرض کیا کہ وہ شخص جو دوسروں کو پچھاڑ دے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس بذلک، ولکنہ الذی یملک نفسہ عند الغضب (۲)

ایسا نہیں ہے، بل کہ پہلوان تو وہ ہے جو غصے کے وقت بھی اپنے نفس کو قابو میں

۱۔ النور: ۲۲

۲۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۹۰، رقم ۲۶۰۸

رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کو ضبط کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے ایک روایت میں فرمایا:

من كظم غيظاً وهو يستطيع ان ينفذه دعاه الله يوم القيامة على رؤس الخلائق حتى يخيره فى اى الحور شاء (۱)

جو شخص قدرت کے باوجود غصے کو ضبط کرے گا اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا، اور اسے اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کرلے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نرمی، غصے کی حالت میں آپ کے عفو و درگزر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم و تحمل کے بارے میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کا یہ جملہ کس قدر جامع اور مبنی برحقیقت ہے:

وهو صلى الله عليه وسلم لا يزال مع كثرة الأذى إلا صبرا وعلى إسراف الجاهل إلا حلما (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے والے مظالم اور زیادتیاں فقط آپ کے صبر میں ہی اضافے کا موجب بنتی تھیں اور جاہل کی زیادتیاں فقط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم میں ہی اضافے کا سبب بنتی تھیں۔

۱۔ ترمذی: ج ۳، ص ۴۱۱، رقم ۲۰۲۸۔ ابوداود: ج ۴، ص ۲۶۴، رقم ۴۷۷۷

۲۔ الشفاء: ج ۱، ص ۶۶۱۔ الشفاء: ج ۱، ص ۶۱

ملامت

غزوۂ خیبر سے واپسی پر سفر کی طوالت سے جب مسلمان تھک کر چور ہو گئے تو انہوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور آرام کے لیے ٹھہرنے کا فیصلہ ہوا۔ رات کا وقت تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فجر کا خیال کون رکھے گا؟ شاید ہم سو جائیں۔

یہ سن کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ بولے:

یا رسول اللہ! میں فجر کا خیال رکھوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیٹ گئے۔ آپ کے ساتھ موجود تمام صحابہ کرام بھی آرام کرنے لگے۔ بلال رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ پتہ نہیں، یہ عمل کب تک جاری رہا، پھر جب وہ تھک گئے تو انہوں نے ایک اونٹ کے ساتھ ٹیک لگائی اور بیٹھ گئے، وقتِ فجر کا انتظار کرنے لگے۔ مگر فجر کا انتظار کرتے کرتے ان کی بھی آنکھ لگ گئی۔ پھر نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی اور نہ کسی اور کی۔ رات گزر گئی اور صبح کے آثار واضح ہو گئے تو سورج کی تپش نے سب کو بیدار کیا۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے، پھر صحابۂ کرام۔ جاگنے کے بعد ہر کوئی بلال کو گھور رہا تھا، اور انہیں اس کا ذمے دار قرار دے رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلال سے مخاطب ہوئے اور ان سے پوچھا:

بلال! تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟

بلال رضی اللہ عنہ نے مختصر جواب دیا:

یا رسول اللہ! مجھے بھی اسی چیز نے آلیا تھا جو آپ کو آ گئی۔ یعنی جیسے سب سو رہے تھے، ویسے ہی میں بھی سو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یہاں سے کوچ کرو۔

صحابہ کرامؓ نے وہاں سے فوری طور پر کوچ کیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سواری سے اترے۔ صحابہ کرامؓ بھی اتر آئے۔ آپ نے وضو کیا۔ لوگوں نے بھی وضو کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھائی۔ آپ سلام پھیر کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

اگر نماز بھول جاؤ تو جب یاد آئے پڑھ لیا کرو۔ (۱)

یعنی ایک یہ غلطی ہوگئی، جو ارادی نہیں تھی، اس کا ارتکاب جان بوجھ کر نہیں کیا گیا، اس لیے جب بھی موقع ملے پہلی فرصت میں اس کا ازالہ کر لیا جائے۔ یہ تو اس واقعے کا ایک پہلو تھا۔ اس کا دوسرا پہلو بھی سبق آموز ہے، اور ہمارے عمومی مزاج کے برعکس۔

ہمارا عمومی مزاج یہ ہے کہ ہم ذمے داریاں تفویض کر کے بالکل لاتعلق ہو جاتے ہیں، حال آں کہ ضرورت کے مطابق انتظامی فیصلوں پر نظرِ ثانی کی گنجائش رہتی ہے، یہ گنجائش ماتحتوں کے لیے بھی رہنی چاہیے، اور کسی بھی سبب سے ہونے والی ہر کوتاہی ملامت کا باعث بھی نہیں بنی چاہیے۔ خصوصیت سے کسی کے عمل سے اگر ہمیں تکلیف پہنچے تو ہم ایک تو طعنے بازی شروع کر دیتے ہیں دوسری ایک ہی کم زوری یا غلطی کو بار بار یاد دلاتے اور وہ واقعہ دہراتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی مزاج یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں سے دل برداشتہ بھی ہوتا ہے، اس سے اس کے اندر منفیت بھی جنم لیتی ہے اور اگر یہ رویہ مستقل طور پر رہنے لگے تو انسان جذباتیت کی رو میں بہہ کر ردِعمل کی ذہنیت کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح ذرا سی بداحتیاطی انسان کو کارآمد شہری سے ضرر رساں بندے میں تبدیل کر دیتی ہے، اور بندہ ہے بھی کیا، بدقسمتی کا سایہ پڑ جائے تو درندہ بننے میں بھی دیر نہیں لگتی۔

۱۔ مسلم: ج۱، ص۳۸۱، رقم ۶۸۰۔ موطا: ج۱، ص۱۳، رقم ۲۵

پھر اس واقعے میں ایک پہلو اور بھی ہے۔ انسان ایسی باتوں سے پست ہمت بھی ہو جاتا ہے، اور اس کی خود اعتمادی مجروح ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں آئندہ وہ کسی بڑی ذمے داری کی تکمیل کے قابل نہیں رہتا۔ لوگوں کو اگر کارآمد رکھنا مقصود ہے تو ان کا اعتماد ہر صورت میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ انسان دوسرے کو غلطی پر ٹوکتے ہوئے بھی اپنے ردعمل کو بار بار چیک کرے، اور ایسا انداز اختیار کرے جو اصلاح کا سبب بنے، جس سے ردعمل کی فضا قائم نہ ہو اور جس کے ذریعے انسان یہ باور کرے کہ وہ کس طرح اپنی کوتاہی درست کر سکتا ہے اس پر قابو پا سکتا ہے۔

غلطی کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ ہر غلطی کو ایک ہی انداز سے دیکھنا اور ایک ہی نوعیت کا ردعمل ظاہر کرنا انصاف سے بھی بعید ہے اور نتائج کے لحاظ سے بھی نامناسب۔

ظالم کی مدد

مظلوم کی مدد ایسا عنوان ہے، جس پر نہ کسی کو اعتراض ہوسکتا ہے، نہ کوئی اچنبھا، لیکن اس کے برعکس اگر الفاظ بدل کر یوں کہا جائے کہ "ظالم کی مدد" تو پھر ہر کوئی چونک اٹھے گا، لیکن یہی مضمون ایک حدیث میں وارد ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انصر اخاک، ظالماً او مظلوماً

اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

اس پر صحابہ کرام کو بھی سوال پوچھنے کی ضرورت پیش آئی اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ!

ہذا ننصرہ مظلوماً، فکیف ننصرہ ظالماً؟

یہ مظلوم کی مدد تو ہم کرتے آئے ہیں، مگر ظالم کی مدد کس طرح کریں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تمنعہ من الظلم (۱)

اس کو ظلم کرنے سے روک دو۔

گویا کہ ظالم کو ظلم سے روک دینا بھی ظالم کی مدد کی ایک اہم اور نہایت کارآمد شکل ہے۔

اس سے قبل مدد اور نصرت کا فلسفہ یہی تھا کہ اس کام میں شریک ہو جاؤ، جو وہ شخص کر رہا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مختصر سے جملے میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے ساتھ ساتھ اس فلسفے کا رخ بھی موڑ دیا اور فرمایا کہ مدد کا مفہوم یہی نہیں کہ کسی کام

۱۔ مسند احمد: ج ۴، ص ۵۸، رقم ۱۲۶۶۶

میں مدد کے خواہش مند کے ساتھ شریک ہو جاؤ اور اس کا ہاتھ بٹاؤ، بل کہ اصل مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ شخص کے ساتھ اس کام کے کرنے میں تعاون کرو جو ہر اعتبار سے مفید ہو اور اس کام کے کرنے سے منع کرو، جو کسی بھی طور پر مضر اور نقصان دہ ہو، خصوصاً جس کا خود اسے بھی نقصان پہنچ سکتا ہو۔

گویا کہ اس اعتبار سے مظلوم تو ہماری مدد اور تعاون کا مستحق ہے ہی، ظالم بھی ہماری اعانت اور نصرت کا حق دار ہے جو کہ بادی النظر میں بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، حال آں کہ یہ بات بہت سادہ اور بہت منطقی ہے، کیونکہ جس طرح مظلوم کو اپنی مظلومیت، بے سرو سامانی اور کم زوری کے سبب دوسرے افراد کی مدد کی ضرورت ہے، اسی طرح ظالم بھی دوسروں کی مدد اور توجہ چاہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مظلوم دوسروں کو مدد کے لیے پکارتا ہے، انہیں بلانے کا شعور رکھتا ہے، لیکن ظالم کو اس امر سے آگہی نہیں ہوتی کہ وہ بھی کم زور ہے اور کسی طاقت ور کی مدد کا مستحق ہے، اسے بھی کسی سے مدد لینی چاہیے، اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو ظالم ہماری مدد و نصرت اور توجہ کا مظلوم سے زیادہ مستحق ہے۔

پھر یہ سوال بھی حدیث مبارکہ میں حل فرما دیا گیا کہ مدد کی نوعیت کیا ہو گی؟ ظالم کی مدد کی یہی صورت ہے کہ اس کا ظلم ختم کر دیا جائے، اس کا بڑھا ہوا اور ظلم کرتا ہوا ہاتھ روک دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں جن میں وہ ظلم و تعدی نہ کر سکے۔ ظلم کی خواہ کتنی ہی قسمیں بیان کی جائیں، وہ اپنی ہر قسم کے اعتبار سے قبیح ہے اور اس بارے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن ظلم جب اجتماعی شکل میں ہوتا ہے تو اس کے اثرات زیادہ دور رس زیادہ دیر پا اور زیادہ وسیع ہوتے ہیں، اس لیے اس کی قباحت و شناعت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے انفرادی حیثیت میں فرد واحد کی سطح پر ہونے والے ظلم بھی ظلم ہے، اسے روکنا بھی ہمارا فرض ہے مگر اجتماعی صورت اختیار کرنے والا ظلم ہماری زیادہ توجہ چاہتا ہے۔

انفرادی سطح پر ہونے والے ظلم کو روکنے کے لیے کی جانے والی کوششیں بھی انفرادی سطح پر درکار ہوتی ہیں، اسی طرح اجتماعی سطح پر ہونے والا ظلم و تعدی کے سد باب و انسداد کے لیے کی جانے والی کوششیں بھی اجتماعی سطح پر ہوں گی تو ان کے اثرات نمایاں ہوں گے، ورنہ اس ظلم کو روکنا اور ظالم کی مدد کرنا ممکن نہیں ہو گا، جس کا اس حدیث مبارکہ میں حکم دیا گیا ہے۔

ظالم کو ظلم سے روکنے کا ایک مفہوم تو واضح ہے کہ ہر ممکن ذریعہ اختیار کر کے اس کا دست ظلم اور دست ستم کار کو روک دیا جائے، مگر اس کا یہ جلی مفہوم ہے، اس کا خفی اور باریک مفہوم یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ نہ کوئی ظالم رہے نہ کوئی مظلوم، اور اگر کوئی شخص فطرتاً بھی ظلم پسند ہو اور ظلم کرنا چاہے تو بھی اس کے لیے ایسے حالات پیدا نہ ہو سکیں جہاں اس کی ظلم پسندی پنپ سکے۔ یہ بات اعلیٰ سطح پر تو بلاشبہ حکومتوں کی ذمے داری ہے، مگر اس سے نیچے کی طرف آئیں تو پھر ہر شخص اپنے اپنے دائرہ کار میں اس بات کا ذمے دار ہے کہ ظالم کو ظلم کرنے سے روکے، تاکہ اس طرح وہ اپنے بھائی کی مدد کر سکے۔ اور اپنے کسی بھی اقدام سے ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دے جو ظلم کے پھیلنے کا سبب بنے۔

کم از کم یہ بات تو ہر ایک کر سکتا ہے کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے جیسے دوسرے بھائیوں پر ظلم کرنے سے باز رکھے۔ اگر ہم سب اس پر کاربند ہو جائیں تو کسی کو بھی شکایت باقی نہیں رہے گی، پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ ظالم کو ظلم سے نہ روکنا خود ظلم میں اعانت کرنے کے مترادف ہے اور کسی نہ کسی درجے میں وہ بھی ظلم کرنے میں ظالم کے ساتھ ہے، جو قدرت رکھنے کے باوجود ظالم کو ظلم کرنے سے باز نہیں رکھ رہا ہے۔

آخر میں اس بات کا ضرور خیال رہے کہ ظلم روکنے کا ہر آدمی اپنے اپنے دائرۂ کار میں، اپنے آپ کو حاصل شدہ اختیارات کی حدود کے اندر ہی مکلف اور ذمے دار ہے۔ اس بات کو بنیاد بنا کر ہر ایک کو شریعت یہ اختیار نہیں دیتی کہ وہ اپنے حدود کار سے باہر تجاوز کرنے لگے اور اس طرح وہ خود دانستہ و نادانستہ ظلم و تعدی کا ذمے دار قرار پائے۔ یہ بات بہ جائے خود ظلم و تعدی کے زمرے میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ عمل کی راہ ہمارے لیے آسان فرمائیں، آمین۔

ملازم سے تعلق

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ معروف صحابیٔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، حضرت زید ایک معزز خاندان کے فرد تھے، مگر ڈاکوؤں نے انہیں پکڑ کر آگے فروخت کر دیا تھا، پھر ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں خرید لیا، وہ کچھ عرصے ان کے پاس رہے، بعد میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا اور متبنیٰ بنا لیا۔

دوسری جانب حضرت زید کے والد اور دیگر اہل خانہ کو ان کے بارے میں عرصے تک علم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ پھر جب انہیں علم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تو ان کے والد نے اپنے شدید جذبات کا اظہار اشعار کی صورت میں کیا اور یہ اشعار انہوں نے حضرت زید کو لکھ بھیجے، ان اشعار سے ان کی قلبی ارادت اور کیفیات کا کس حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے، اشعار کا ترجمہ دیکھیے، وہ کہتے ہیں:

> خدا کی قسم میں قطعاً نہیں جانتا اگرچہ پوچھتا بھی رہتا ہوں کہ کیا تمہیں زمین نے نگل لیا یا پہاڑ کھا گیا، کاش میں جانتا کہ مدت العمر میں کبھی تیرا آنا ممکن بھی ہے؟ سو میرے لیے دنیا میں تیرا لوٹ کے آنا ہی کافی ہوتا، آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی یاد دلاتا ہے اور وہ غروب ہوتے ہوئے بھی اس کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے، بادِ بہاری کا ہر جھونکا اس کی یاد کو (ہمارے دلوں میں) ابھارتا ہے، آہ مجھے اس (گم شدگی) پر کس قدر رنج و غم ہے؟ عن قریب میں اونٹ کی مانند چل کر ساری دنیا چھان ماروں گا اور اس سیاحت سے تمام عمر نہیں تھکوں گا، جب تک کہ اونٹ نہ تھک جائے، میں یہ عمل زندگی بھر دہراتا رہوں گا، یا پھر مجھ پر موت

طاری ہو جائے گی، ہر شخص فنا کے گھاٹ اترنے والا ہے، خواہ اسے سراب امید دھوکے میں ہی کیوں نہ ڈالے رکھے۔

ایک باپ کی جانب سے اپنے بیٹے کے لیے اس قدر شدید جذبات اگر چہ نا قابلِ فہم نہیں، لیکن متاثر کن ضرور ہیں، مگر ملاحظہ کیجیے کہ بیٹا ان جذبات کا جواب کس پیرائے میں اور کس اسلوب میں دیتا ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار پڑھ کر اشعار ہی کی زبان میں اپنے والد کو جو پیغام بھیجا، اس کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے، وہ کہتے ہیں:

> میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں، گو ان سے دور ہوں، کیوں کہ میں مشعر حرام کے نزدیک بیت اللہ میں رہتا ہوں، اس لیے آپ لوگ اس غم سے باز آجائیں، جس نے آپ سب کو دردمند کر دیا اور اونٹوں کی طرح چل کر اس دنیا کی خاک مت چھانو، الحمد للہ میں بنی سعد کے ایک معزز خاندان میں ہوں جو پشت ہا پشت سے عزت وشرف رکھتا ہے۔

غور کیجیے کہ ایک بیٹا اپنے باپ اور باقی خاندان سے بچھڑ گیا ہے، عرصے تک اسے ان کی خیریت تک معلوم نہیں ہوتی اور جب اسے اپنے خاندان کی موجودگی اور ان کی جانب سے اپنی تلاش کی اطلاع ملتی ہے اور اسے علم ہوتا ہے کہ خاندان والے کس سرگرمی سے اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ ان سے ملنے کے لیے کسی خاص اشتیاق کا مظاہرہ نہیں کرتا بل کہ الٹا انہیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ اس کی تلاش ترک کر دیں، وہ اچھے حال اور اچھے ماحول میں ہے اور ہر طرح سے مطمئن بھی، پھر جب حضرت زید کے والد کو اطلاع ہوئی تو وہ اور حضرت زید کے چچا انہیں لینے کے لیے آئے، مگر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ رویہ اگر چہ بالکل درست تھا، مگر ان کے والد اور چچا کے لیے سخت حیران کن تھا، انہوں نے حضرت زید کا جب یہ جواب سنا تو انہیں تنبیہ کرتے ہوئے اور اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا اے زید، افسوس ہے تم پر کیا تم غلامی کو آزادی پر اور اپنے باپ، چچا اور گھر والوں پر ترجیح دے رہے ہو؟ اس پر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے انہیں جو جواب دیا وہ اس سارے قصے کا ماحصل ہے۔ انہوں نے فرمایا:

نعم انی قد رایت من ہذا الرجل شیئا ما انا بالذی اختار علیه احدا ابدا (۱)

ہاں میں نے اس شخص (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) میں کچھ ایسی ہی خوبی دیکھی ہے کہ میں ان پر کسی کو بھی کبھی بھی ترجیح نہیں دے سکتا۔

دوسری روایت کے مطابق اس موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو خود اختیار دے دیا تھا کہ چاہے تو وہ اپنے چچا کے ساتھ اپنے قبیلے میں واپس لوٹ جائیں اور اگر وہ پسند کریں کہ آپ کے ساتھ ہی رہیں گے تو یہ بھی منظور ہے، لیکن حضرت زید نے اپنے خاندان سے دائمی جدائی تو منظور کر لی، مگر رسولِ رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علیحدہ ہونا تسلیم نہیں کیا۔

اس سارے قصے میں ہمارے لیے یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ عام فطرت انسانی کے برخلاف حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ طرزِ عمل کس بنا پر تھا؟ اور انہوں نے جو یہ فرمایا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ بات دیکھی تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ متاثر کن بات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ تھے، آپ انسانی مساوات پر عملاً اس درجے یقین رکھتے تھے کہ اس سے آگے جانا ممکن ہی نہیں، کیوں کہ اس کے آگے کوئی راہ ہی باقی نہیں رہتی۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہے کہ عرب میں غلاموں کی حیثیت کو متعین کر لیا جائے، اہل عرب کے ہاں غلاموں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اور غلام باندیوں کے بغیر کسی متوسط درجے کے خاندان کی بھی تکمیل ممکن نہ تھی، کیوں کہ اس دور کے عام ملازمین بھی یہی تھے، جو دفتری اور گھریلو دونوں طرح کے امور میں معاونت اور خدمت کا فریضہ انجام دیتے تھے، لیکن ان کے حقوق کچھ متعین نہ تھے، بل کہ عملاً ان کی حالت جانوروں سے بدتر تھی کہ وہ مکمل طور پر اپنے مالک کے رحم وکرم پر ہوتے تھے، آج کے دور میں ملازمین اور نوکروں پر ان کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ انہیں بہت سے حقوق حاصل ہیں جن

۱۔ طبقات: ج ۳، ص ۴۲

سے غلام یک سر محروم تھے۔

ایسے کسی غلام سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمت و شفقت بھرا سلوک یقیناً متاثر کن امر اور گرویدہ کرنے والا عمل تھا، پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن سلوک اسی حد تک نہیں رہا کہ ان کے قیام، طعام کا خیال رکھا بل کہ انہیں آزاد فرما کر اپنا منہ بولا بیٹا (متبنیٰ) بھی بنالیا، حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے یقیناً یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

امت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہونے کی حیثیت سے آج ہمارے لیے اس واقعے سے درس عبرت حاصل کرنے کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، آج مسئلہ غلامی کا عملاً کرۂ ارض سے خاتمہ ہو چکا ہے، آج ہمارا واسطہ ان سے زیادہ بہتر حیثیت، سماجی رتبے اور اچھے مقام کے حامل ملازمین سے پڑتا ہے، جنہیں شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً غلاموں سے زیادہ بہتر بل کہ کہیں زیادہ بلند حیثیت حاصل ہے، لیکن ان کے ساتھ ہمارا رویہ بعض اوقات تو چودہ صدی قبل کے غلاموں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اور ان سے تحقیر و تنقیص پر مبنی سلوک تو ہمارے روزمرہ کے معمولات کا حصہ ہے (الا ماشاء اللہ) سوچا جائے تو یہ ہمارے ''خیالی تفوق'' کے سوا کچھ نہیں، آخر ان میں ایسی کون سی کمی ہے، جو رشتۂ انسانیت میں انہیں ہم سے کم تر ثابت کرتی ہے؟ قانون قدرت کے مطابق کسی کا ماتحت ہونا تو کوئی کم زوری یا خامی کی علامت نہیں، یہ تو نظامِ عالم کا یہ حصہ ہے، جس پر نہ کسی کو خود ساختہ فخر زیب دیتا ہے نہ دوسری جانب کسی کے لیے اس میں احساسِ کم تری میں مبتلا ہونے کا کچھ سامان ہے۔ ایسے میں کسی کو تحقیر کی نظر سے دیکھنا کیا معنیٰ؟ درحقیقت یہ نفسیاتی کم زوری ہے، جو احساس برتری کا ایک حصہ ہے، گویا کہ یہ قابلِ اصلاح اور قابل علاج مرض ہے نہ کہ کچھ اور۔

اگر ہم شریعتِ محمدی پر یقین رکھتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے بہترین راہ عمل تصور کرتے ہیں تو ہمیں اس باب میں بھی اپنا محاسبہ کرنا ہوگا اور اس سلسلے میں ہم جن کوتاہیوں، خامیوں اور کم زوریوں سے دوچار ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا ہوگی، یقیناً نماز روزے سمیت دیگر عبادات کے ساتھ ان امور کی اصلاح بھی ہم سب پر فرض ہے اور یہ امور بھی شریعتِ مطہرہ کے ان احکامات میں شامل ہیں، جن پر شریعت کے مطابق عمل پیدا ہونے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور روزِ آخرت جن کا حساب ہوگا۔

ملاقات کا ادب

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آنے کی اجازت مانگی، میں اس وقت گھر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھی، آپ نے فرمایا کہ یہ شخص قبیلے کا برا آدمی ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آنے کی اجازت دے دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ساتھ ہنس رہے ہیں، جب وہ شخص نکل کر چلا گیا تو میں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے اس شخص کے بارے میں تو یہ بات کہی تھی، پھر جلد ہی آپ اس کے ساتھ (بے تکلفی سے) ہنس کر گفت گو کرنے لگے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من شر الناس من اتقاہ الناس لشرہ (۱)

لوگوں میں سے بدترین آدمی وہ ہے، جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا ترک کردیں۔

انسانی معاشرتی زندگی میں ملاقات ایک ضروری چیز ہے، اسی وجہ سے اہمیت کی حامل ہے، اس کے بنیادی ادب میں سے یہ ہے کہ انسان جب کسی سے ملے تو اس کے بارے میں اپنے ذاتی دلی جذبات کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس سے خندہ پیشانی سے پیش آئے اور حسن خلق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے اس کی دل آزاری ہو، نہ ایسی کوئی حرکت کرے، نہ ایسا رویہ اپنائے جو بداخلاقی کا مظہر ہو۔ یہ ہم سے شریعت کا تقاضا بھی ہے

۱۔ موطا مالک: ج ۲، ص ۹۰۳، رقم ۱۶۰۵

اور اسلام کے احکامات میں سے ایک حکم بھی۔

جیسا کہ یہ بات عام اخلاقیات میں سے بھی ہے اور ہر شخص اس سے واقف ہے لیکن ہمارا عمل اس لیے اس پر کمزور ہو جاتا ہے کہ ہمیں اس کا خیال نہیں رہتا کہ یہ شریعت کا حکم بھی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے، اور آپ کی ایسی کون سی سنت ہے جو ہمارے لیے مفید نہ ہو، یا جس پر عمل پیرا ہو کر ہم دنیاوی فوائد اور اخروی اجر وثواب کے حق دار نہ بنتے ہوں؟

انسان جب کسی سے ملتا ہے تو اس کے احساسات مختلف ہوتے ہیں اور اگر وہ اس شخص کو پہلے سے جانتا ہے تو ذہن اس بارے میں کوئی نہ کوئی واضح خیال رکھتا ہے، یا تو اسے پسند کرتا ہے، اس سے گفت گو اور ملاقات کرنا چاہتا ہے، اس سے مل کر خوشی محسوس کرتا ہے، یا اس کے برعکس وہ مذکورہ شخص کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہیں پاتا، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کا کبھی سامنا نہ کرنا پڑے، وہ چاہتا ہے کہ اس سے ملاقات نہ ہو، یا اگر ہو تو سرسری نوعیت کی ہو، اگر ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق ہو جائے تو جلد سے جلد پیچھا چھڑانا چاہتا ہے، اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ نشست جلد اختتام کو پہنچے۔

یہ خیالات یک طرفہ بھی ہوتے ہیں اور دو طرفہ بھی، یعنی ملنے والے دونوں اشخاص ایک دوسرے کے بارے میں یک ساں رائے رکھتے ہیں، مثلاً دونوں ہی ایک دوسرے سے ملنے کے خواہاں نہیں ہوتے، یا ایسا ایک جانب سے ہوتا ہے، یعنی فریقین میں سے ایک تو ملنے اور اچھے انداز میں ملنے کا خواہاں ہوتا ہے، لیکن دوسرا فریق اس سلسلے کو پسند نہیں کرتا، خاص طور پر اس دوسری صورت میں اصل امتحان درپیش ہوتا ہے، اگر کسی وجہ سے ہمیں کسی شخص کا ملنا پسند نہیں تب بھی ملاقات کے وقت ناگواری یا بےزاری کا ادنیٰ تاثر بھی ہمارے چہرے، حرکات وسکنات اور رویے سے ظاہر نہیں ہونا چاہیے اور فریق ثانی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہئے، اور پورے اکرام واعزاز کے ساتھ گفت گو کرنے کے بعد مکمل احترام کے ساتھ رخصت کرنا چاہئے، اس طرح کہ اسے آپ کے رویے اور برتاؤ سے ادنیٰ شکایت بھی پیدا نہ ہو اور وہ پوری بشاشت کے ساتھ واپس لوٹے، نہ کہ آپ کی طرف سے اپنے دل میں کدورتیں لے کر جائے۔ اس حدیث کا یہی مفہوم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جو شخص آپ سے ہاتھ ملاتا، آپ اس وقت تک اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، جب تک وہ خود اپنے ہاتھ نہ چھڑا لیتا، اس میں کسی قسم کے افراد کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا، تو انہیں بہت سی ہدایات اور وصیتیں فرمائی تھیں، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری وصیت فرمائی وہ یہ تھی:

احسن خلقک للناس یا معاذ بن جبل (۱)

لوگوں کے ساتھ اپنے اخلاق اچھے رکھنا، اے معاذ بن جبل۔

اس روایت میں حسن خلق کی جس قسم کا ذکر ہے اس کی ضرورت بھی ملاقات اور ملنے جلنے کے وقت ہی پیش آتی ہے، اس میں خاص طور سے حکم رانوں اور بالا دست طبقے کے لیے ہدایات ہیں، کیوں کہ اس طبقے سے اس بارے میں زیادہ شکایات منسوب ہیں اور ان سے عوام الناس کو زیادہ شکایات رہتی ہیں۔ ان طبقات میں صورت حال اس وقت زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے، جب متعلقہ اشخاص دین داری کے معاملے میں ظاہری اعتبار سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، لیکن گفت گو اور ملنے جلنے کا جب موقع پیش آتا ہے تو عام طور سے ان کا رویہ اطمینان بخش نہیں ہوتا، حال آں کہ کسی سے بشاشت کے ساتھ ملنے کو بھی صدقہ قرار دیا گیا ہے اور اس بات کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ کسی کو بھی حقیر نہ سمجھا جائے اور کسی کی بھی تحقیر نہ کی جائے، یہ بات شرف انسانیت کے منافی ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو کسی بھی بنیاد پر مختلف خانوں میں تقسیم کرنے لگے اور پھر اپنی اس تقسیم کو بنیاد بنا کر اعزاز، عزت اور فضیلت کی تعیین کرنے لگے۔ آدمی کو یہ شرف کسی اور نے نہیں خود اللہ نے بخشا ہے، اس لیے اگر کوئی کسی کو اس شرف کا مستحق نہیں سمجھتا تو گویا وہ اللہ کی اس عطا کا انکار کرتا ہے۔

اس لیے ہمیں اس بارے میں بھی اپنے برتاؤ اور اخلاق کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانا چاہیے، شاید کہ یہی امر ہماری عبادات کی قبولیت کا سبب بن جائے۔

۱۔ موطا: ج ۲، ص ۹۰۲، رقم ۱۶۰۲

اپنے اپنے مقام پر

سن تین ہجری کا واقعہ ہے، ۵ شوال کو مشرکین مکہ تین ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کے ارادے سے مکہ مکرمہ سے نکلے اور مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے، یہ لشکر ہر اعتبار سے مسلح اور ہر طرح کی تیاری کے ساتھ آیا تھا، اس جنگ کو غزوۂ احد کہتے ہیں، یہاں اس تاریخی غزوے کی تفصیل پیش کرنا مطلوب نہیں، صرف اس غزوے میں پیش آنے والے ایک واقعے کی جانب توجہ دلانا مطلوب ہے۔

اس غزوے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے لشکر کی صف بندی کی تو احد کو پشت پر رکھ کر صفیں ترتیب دیں، پشت ہی کی جانب ایک ایسا درہ بھی تھا، جہاں سے دشمن کے سپاہیوں کی جانب سے حملے کا احتمال تھا، اس خطرے کا ازالہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہاڑی درے پر پچاس تیر اندازوں کو متعین فرما دیا، اور انہیں حکم دیا کہ ہر صورت میں اپنی جگہ پر قائم رہیں اور شکست یا فتح کسی صورت میں بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ جنگ کا آغاز ہوا، گھمسان کا رن پڑا، مسلمان بے جگری سے لڑے اور بالآخر مشرکین مکہ پسپائی پر مجبور ہو گئے، اس وقت ان تیر اندازوں میں سے بعض کہنے لگے کہ مال غنیمت حاصل کرنے کا موقع آ گیا ہے، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے جنہیں اس دستے کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا، انہیں منع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم انہیں یاد دلایا، لیکن وہ نہ مانے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے۔

یہ دیکھ کر عقب سے مشرکین حملہ آور ہو گئے اور مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔(۱)

۱۔ بخاری: کتاب المغازی

دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تیر انداز دستے کو تلقین و ہدایت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الزموا مکانکم، لا تبرحوا منه، فاذا رایتمونا نهزمهم حتی ندخل فی عسکرهم فلا تفارقوا مکانکم، وان رایتمونا نقتل فلا تغیثونا ولا تدفعوا عنا، وارشقوهم بالنبل، فان الخیل لا تقدم علی النبل، انا لن نزال غالبین ما مکثتم مکانکم، اللهم انی اشهدک علیهم (۱)

تم اپنی جگہ جمے رہنا اور وہاں سے مت ہلنا، اگر تم دیکھو کہ ہم دشمن کو شکست دے کر اس کا پیچھا کرتے ہوئے ان کے پڑاؤ میں داخل ہو گئے ہیں، تب بھی اپنی جگہ مت چھوڑنا اور اگر تم ہمیں قتل ہوتے ہوئے دیکھو تو بھی ہماری مدد کو مت آنا اور نہ ہی دشمن کو پیچھے دھکیلنے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا، بل کہ ان کو تیر اندازی سے ہی روکنا، کیوں کہ گھوڑے سوار لشکر کو تیروں کی ہی بوچھاڑ سے روکا جاسکتا ہے، جب تک تم اپنی جگہ پر جمے رہو گے، ہم دشمن پر غالب رہیں گے، اے اللہ میں تجھے اس بات پر گواہ بناتا ہوں۔

اس واقعے میں ہمارے مناسب حال بہت سے سبق، حکمتیں اور عبرتیں پوشیدہ ہیں، جن پر توجہ دیں تو رہ نمائی کے کتنے ہی راستے سامنے نظر آنے لگتے ہیں اور ہدایت کی روشنی ملتی ہے مثلاً:

۱۔ سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آجائے تو پھر حیل وحجت اور چوں چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی، انسان کا ہر طرح کا اختیار ختم ہو جاتا ہے، اب صرف ایک ہی راستہ باقی بچتا ہے اور وہ ہے اس حکم کی بجا آوری اور اس پر عمل پیرا ہونے کا راستہ۔ ظاہر ہے کہ اس واقعے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو سامنے تھا ہی، اللہ تعالیٰ کی رضا بھی آپ ہی کے حکم میں پوشیدہ تھی۔ اسی طرح یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واضح ہو تو پھر اس میں نہ حکمتیں اور اس کی

۱۔ حلبی: ج۲، ص ۴۹۷

وجوہ تلاش کرنا مفید اور کارِ خیر ہے، نہ اپنی عقل سے اس کی توجیہ یا اس پر عمل پیرا ہونے کی کوئی صورت بیان کرنا سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔ فائدہ ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو اس کی اصلی صورت میں ماننے اور اس پر عمل کرنے سے ہوگا، ورنہ سراسر نقصان ہے۔ خواہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی حکمت تک کسی کی عقل کی رسائی ہو یا نہ ہو۔

مذکورہ بالا واقعے میں بھی جن تیراندازوں نے وہ جگہ چھوڑ دی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بہ راہ راست تو مخالفت نہیں کر رہے تھے، وہ اپنے فہم سے یہی سمجھے کہ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود چوں کہ ان کا یہ عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے خلاف تھا اس لیے نہ صرف یہ کہ اس کے نتیجے میں نقصان ہوا، بل کہ اس کوتاہی کے نتائج تمام مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔

۲۔ دوسرا نکتہ اس واقعے سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر شخص کو جو ذمے داریاں تفویض کی گئی ہیں، اس کا وظیفۂ حیات یہ ہے کہ وہ ان کی بجا آوری میں اپنی انتہائی صلاحیتوں کو پوری ایمانداری کے ساتھ صرف کردے اور نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے، ان شاء اللہ نتیجہ بہ ہر صورت بہتر ہی نکلے گا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طبقۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے اجتماعی کے ساتھ انفرادی ہدایات بھی فرمائی ہیں، تاجروں کے لیے الگ قوانین ہیں، آجروں کے لیے الگ، اساتذہ کے لیے الگ ہدایات ہیں، طلبہ کے لیے الگ، والدین کے لیے علیحدہ قوانین ہیں، اولاد کے لیے علیحدہ۔ اب ہر ایک کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے حصے کے فرائض اپنی انتہائی ایمان داری سے ادا کرے اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہ کرے، جب ہر شخص اپنی اپنی جگہ درست نہج پر سرگرم رہے گا تو بگاڑ اور فساد بھی برپا نہیں ہوسکے گا اور صلاحیتوں کے صحیح مقام پر صرف ہونے کے سب فوائد بھی زیادہ حاصل ہوں گے اور ایک دوسرے سے شکایات بھی کم سے کم پیدا ہوں گی، اس طرح منفی سرگرمیاں ازخود مثبت کارگزاری میں تبدیل ہوجائیں گی۔

۳۔ ایک اہم سبق ہمیں یہ ملتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو ہر امر پر فوقیت دے کر اپنے آپ کو ایک منظم و مربوط قوم میں ڈھال لیں اور ایک امت کی شکل اختیار کرلیں، جو جسدِ واحد کی مانند متحدہ منظم ہو، ایک ہجوم کی طرح نہیں، جو کسی ناگہانی آفت یا

حادثے کے سبب جائے وقوع پر جمع ہو جاتا ہے، جس کی باہم نہ منزل ایک ہوتی ہے، نہ سوچ، نہ مقاصد ایک جیسے ہوتے ہیں نہ خیالات، نہ ارادے یک ساں ہوتے ہیں نہ قائد ہی ایک ہوتا ہے، ایک وقتی حادثہ انہیں یکجا کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ ہجوم کائنات میں گم ہو کر اپنا نشان تک کھو بیٹھتا ہے۔

۴۔ اور آخری بات یہ ہے کہ اپنے اپنے محاذ پر جمے رہو، ڈٹے رہو، اس یقین کے ساتھ کہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں)

انا لن نزال غالبین ما مکثتم مکانکم (۱)

ہم ہمیشہ اپنے مخالف فریق پر غالب رہیں گے، جب تک کہ تم اپنے اپنے محاذ پر جمے رہو گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو فکر سلیم عطا کریں، تدبر اور غور و فکر کی صلاحتیں ہم میں بیدار کریں اور ہمیں ہر طرح کی کامرانیوں سے سرفراز فرمائیں، آمین۔

۱۔ حلبی: ج ۲، ص ۴۹۷

اجتماعیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اہم پہلو اجتماعیت ہے۔ انسان کو مدنی الطبع کہا جاتا ہے، یعنی ایسا جاندار جو دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی زندگی گذارنے کا عادی ہو، اب یہ دوسروں سے ملنا کس نوعیت کا ہو؟ اگر اس میں باہمی الفت ومحبت، رواداری اور احترام کی کیفیت ہے تو اس سے اتحاد واتفاق جنم لے گا، اور اگر اس میں احترام الفت ومحبت کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو پھر انتشار ہوگا اور افتراق پھیلے گا، پہلی صورت محمود ہے اور اسلام کو مطلوب بھی ہے۔ جب کہ دوسری صورت کے مضر، غیر محمود اور ممنوع ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔

اتحاد واتفاق اجتماعیت کے لیے نہایت ضروری ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعیت اتحاد و اتفاق ہی کی ایک قسم ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر اتحاد واتفاق اور اجتماعیت کی تلقین اور تاکید فرمائی ہے۔

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ ابتدا میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ کیا، انہیں شام کے اطراف ہی میں دشمن سے مقابلہ درپیش تھا، وہاں پہنچ کر انہیں علم ہوا کہ دشمن کے مقابلے میں لشکر ناکافی ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مزید کمک بھیجنے کی درخواست روانہ کی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید دوسو صحابہ کرام کو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں روانہ کردیا۔

جب یہ دستہ پہلے دستے سے ملا تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ ان دونوں دستوں کا امیر

کون ہو؟ حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ دستہ میری مدد کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے یہ میری ہی امارت میں کام کرے گا، حضرت ابوعبیدہ اللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان سے اتفاق نہ کر سکے، ان کا کہنا تھا کہ یا تو دونوں دستے الگ الگ امیروں کے زیرکمان کام کریں یا پھر دونوں کی قیادت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کریں۔

جب اختلاف بڑھا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عہد دھرایا، یہی عہد پیش کرنے کے لیے یہ واقعہ یہاں درج کیا گیا، انہوں نے کہا کہ اے عمرو بن العاص! جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری عہد لیا، وہ یہ تھا:

إذا قدمت على صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا

جب تم اپنے ساتھی سے ملو، تو ایک دوسرے کی بات ماننا اور باہم اختلاف میں مبتلا نہ ہو جانا۔

اس کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

وإنك والله إن عصيتني لأطعتك (۱)

اور خدا کی قسم اگر تم میری نافرمانی کرو گے، تب بھی میں تمہاری پیروی کروں گا۔

دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کس قدر برمحل، پرحکمت اور جامع تھیں؟ اور ملاحظہ کیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ سلم کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا قول اور عمل دونوں اس پر کس قدر پورا اتر رہے تھے۔ یہ تھی درحقیقت ایک فاتح قوم کی اسپرٹ۔ اسلام ان تمام باتوں کو درگزر اور نظرانداز کرنے کی تلقین کرتا ہے، جو بڑے مقاصد کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کریں اور مسلمان، آج کل تو خاص طور پر ان ہی باتوں میں الجھ کر اپنی صلاحتیں برباد کر رہے ہیں جو پیدا ہی اس لیے کی گئیں ہیں کہ وہ ان میں الجھ کر اصل مقاصد سے دور ہو جائیں۔

اسلام نے ہر جگہ اجتماعیت کی تلقین کی ہے اور طرح طرح سے اس کا درس دیا ہے، اولاً تو یہ دیکھیے کہ وہ کسی ایک فرد کو کوئی حکم تلقین نہیں کرتا، وہ تو من حیث المجموع پوری قوم سے مخاطب

۱۔ ابن ہشام: ج ۶، ص ۳۵

ہوتا ہے، اور اسلام کے احکام وقوانین بھی امت واحدہ، امت مسلمہ کی اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں، وہ اگر فرد پر بھی واجب ہوتے ہیں تو اس حیثیت سے کہ وہ فرد اپنی جگہ پر امت مسلمہ کے غیر منقسم وجود کا ایک حصہ ہے، جس کا اس امت سے ہٹ کر اور علیحدہ رہ کر کوئی وجود نہیں۔

اسلام نے اجتماعیت کی تلقین کے لیے عبادت کو بہت خوب صورتی اور غیر محسوس طریقے سے استعمال کیا ہے، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج چاروں ارکان اسلام اس کی واضح مثال ہیں، اسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ ایک ہی کام جب انسان تنہا انجام دیتا ہے تو اس کے لیے اجر کچھ ہوتا ہے اور جب وہی کام چند مسلمان مل کر ادا کرتے ہیں تو اس کا اجر بڑھ کر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

نبی رحمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہدایات اور تعلیمات کے ذریعے اجتماعیت کے حوالے سے مسلمانوں کے ذہنی افق کو وسیع کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مومنین کو جسد واحد کی مانند قرار دیا ہے اور فرمایا:

مثل المؤمنين فى توادہم و تراحمهم و تعاطفهم، مثل الجسد، اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى (۱)

تم مومنوں کو آپس میں محبت ومہربانی کرنے میں ایسا دیکھو گے کہ گویا وہ ایک جسم ہیں اور جب جسم کے کسی حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔

دوسری روایت میں فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً (۲)

ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط بناتا ہے۔

۱۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۰، رقم ۲۵۸۶

۲۔ بخاری: کتاب الادب، باب ۳۶

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے بتایا کہ یوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اتحاد و اجتماعیت کی تلقین کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا:

شیطان ایک اور دو افراد کے پیچھے لگ جاتا ہے، لیکن جب یہ تین افراد ہوں تو انہیں پریشان نہیں کرتا۔(۱)

صحابہ کرام کے ہی دور کا قصہ ہے، لوگ جب کسی سفر میں پڑاؤ ڈالتے تو مختلف گھاٹیوں اور وادیوں میں فروکش ہو جاتے تھے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ تمہارا یوں منتشر ہو جانا شیطانی چال ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تاکید کے بعد صحابہ کرام جب کہیں ٹھہرتے تو ہر فرد دوسرے سے یوں چمٹ جاتا کہ اگر ان پر ایک کپڑا ڈالا جائے تو وہ سب پر محیط ہو جائے۔(۲)

صحابہ کرام کا یہ عمل جہاں ایک جانب رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی روشن اور قابل تقلید مثال تھا وہیں یہ ان کا یہ عمل جذبات کی ہم آہنگی، محبت و الفت کے تبادلے اور صفوں کے اتحاد کی بھی بہترین مثال تھی۔

انسان کو اپنی دنیاوی حیات میں بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں جب وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی مدد کا محتاج و طلب گار ہوتا ہے۔ اب اس مدد کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں، وہ کسی فریق کے ظلم و چیرہ دستیوں کا شکار ہو کر ان سے بچنے کے لیے مدد کا طالب ہوسکتا ہے، اسے روزمرہ کے معاملات میں تعاون کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے، وہ اپنے کسی گناہ یا خطا کے سلسلے میں پردہ پوشی کا بھی طالب ہوسکتا ہے، یہ امداد اس جیسے تمام امور پر انسان کی اجتماعی زندگی کے حوالے سے نہایت اہم ہے، ان امور میں اگر مناسب مثبت قدم اٹھایا جائے تو معاشرہ سدھر بھی سکتا ہے اور اجتماعیت کی فضا بھی پروان چڑھ سکتی ہے، اور اگر انسان ایسے مواقع پر لاتعلقی کا مظاہرہ کرے یا اس کا رویہ منفی ہو تو معاشرہ مزید خرابیوں کی راہ پر بھی چل

۱۔ موطا مالک

۲۔ ابوداؤد

نکل سکتا ہے۔

نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے اس سلسلے میں جامع ہدایت فرمائی ہے، آپ نے فرمایا:

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے دشمن کے سپرد کرتا ہے جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کی حاجت پوری کرتا ہے، اور جو شخص کسی مسلمان سے اس کی مصیبت دور کرے گا، اللہ اس کے قیامت کے مصائب دور کرے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ اس کی پردہ پوشی کرے گا۔(۱)

ظاہر ہے کہ ایسا کون شخص ہے جسے ان امور میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی ضرورت نہ ہوگی؟ سو جب اللہ تعالیٰ کی نصرت کے حصول کا طریقہ خود اللہ نے بتا دیا تو اس کے درست ہونے میں بھی کوئی تردد نہیں ہوسکتا، ایسے میں ان ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے راستے میں کون سی رکاوٹ ہوسکتی ہے؟

۱۔ بخاری/کتاب المظالم، باب لایظلم المسلم المسلم

ہماری غذا

آج کل شادیوں کا موسم ہے، ہر جانب سے دعوتوں کی یلغار ہے، قوم کا نوے نہیں تو ستر، اسی فیصد طبقہ آج کل ہفتے میں کم از کم چار پانچ روز کسی نہ کسی دعوت میں مدعو ہوتا ہے، اور ایسا بھی بہت سی مرتبہ ہوتا ہے کہ ایک ہی روز کئی ایک مقامات سے دعوتیں آجاتی ہیں، ایسے میں تعلقات اور چند دوسرے عوامل کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ موقع ہمیں بہت سے پہلوؤں سے دعوتِ فکر دے رہا ہے، ہم آج کی نشست میں صرف ایک پہلو یعنی کھانوں کی کثرت کے حوالے سے گفت گو کریں گے۔

آج ہم جب کسی دعوت میں کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو کیا ہمیں یہ خیال گزرتا ہے کہ ہمارے پیغمبر ہادیٔ برحق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دسترخوان کن اشیائے خوردونوش سے سجا ہوا ہوتا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غذا کیا تھی، اور آپ نے ان کھانوں سے اپنی حیاتِ طیبہ میں کتنی بار لطف اٹھایا؟

آج ہمارے سامنے جو کھانے پیش ہوتے ہیں، وہ دو اعتبار سے ہم سب کے لیے سوالیہ نشان ہیں۔ ایک تعداد کے لحاظ سے، آج کل دعوتوں میں عام رواج یہ ہے کہ ہلکے سے ہلکی دعوت میں بھی میٹھے کے علاوہ تین چار طرح کی ڈشیں ضروری ہیں، اور متوسط درجے کی دعوتوں میں چار سے چھ طرح کی نمکین ڈشیں اور دو طرح کے میٹھے ضروری ہیں، جب کہ اعلیٰ سطح کی دعوتوں میں کھانے کی کوئی تعداد مقرر نہیں، جب کہ سلاد و چٹنیاں وغیرہ اس کے علاوہ ہیں، جن کی تعداد بعض اوقات پندرہ سے بیس تک جا پہنچتی ہے۔ یہ سب اس ملک، شہر اور محلے میں ہوتا ہے جس کے قریب ہی کہیں کچی آبادی میں، کہیں لب سڑک اور کہیں یوں ہی کسی کونے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ان بھرے پیٹوں، آسودہ چہروں، خوش لباسوں اور ہنستے مسکراتے

جوڑوں کو حیرت، حسرت و تاسف کی نگاہ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، جنہیں یہ امید تک نہیں ہوتی کہ یہ گزرتی ہوئی شب انہیں زیادہ نہیں تو اتنے ہی لقمے بھی دے پائے گی کہ جنہیں حلق سے نیچے اتار کر وہ سکون کے ساتھ اپنی کمر سیدھی کر سکیں اور اگلے روز کے لیے پھر سے اسی مشقت کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو سکیں۔

اسی طرح ان دعوتوں میں ضائع ہونے والا کھانا از خود بہت بڑا سوالیہ نشان ہے، جس کی ایک بڑی وجہ خود کھانوں کی اقسام کی کثرت بھی ہے۔ اگر محض دو طرح کے کھانے ہوں تو اس ضیاع کا تناسب بھی کم ہو سکتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ ہر شخص پہلے ہی ہلے میں اتنا کچھ نکال لیتا ہے کہ جو اس جیسے کم از کم دو افراد کے لیے کافی ہو سکتا ہے، اب ظاہر ہے کہ وہ ایک شخص کا کھانا ہی کھا سکتا ہے، دوسرے کی جگہ وہ خود تو سیر ہونے سے رہا۔ اس طرح محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ہاں ایک دعوت میں جتنے افراد موجود ہوتے ہیں ان کی تعداد کے نصف کے قریب مزید افراد کو کافی ہونے والا کھانا ضائع ہو جاتا ہے، جو اگر کسی مستحق کے پیٹ میں جاتا تو بھوکے سونے والے افراد کے تناسب میں خاطر خواہ کمی واقع ہو سکتی تھی۔

کھانوں کی کثرت کے حوالے سے ایک اور چیز بھی نوٹ کی جا رہی ہے کہ خصوصاً موسم سرما کی دعوتوں میں مشروبات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں، کیوں کہ ٹھنڈے مشروبات تو اپنی جگہ ہوتے ہی ہیں، ان کے ساتھ چائے، کافی وغیرہ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے، بل کہ بعض مقامات پر تو چائے کے ساتھ دودھ وغیرہ بھی موجود ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب اسراف کی شکلیں ہیں، جنہیں کوئی جواز نہیں دیا جا سکتا۔

آیئے اس تناظر میں دیکھیں کہ ہادی برحق رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کیا تھا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ما اکل النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبزاً مرققا و لا شاةً مسموطةً حتی لقی اللہ (۱)

۱۔ بخاری: ج ۳، ص ۲۰۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو پتلی روٹی (چپاتی) کھائی اور نہ دم پخت کی ہوئی (مسلّم) بکری، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔

ملاحظہ کیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین صحابی بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا اور روزمرہ کا سامان خورد و نوش کس قدر سادہ اور تکلفات سے آزاد تھا، ہماری آج کی زندگی جس طرح تکلفات اور ان سے بھی بڑھ کر تعیشات کا مرکز بن چکی ہے، اور کھانے پینے کے ہمارے لوازم جس طرح مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں ان کو دیکھ کر سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہمارے آج کے دستر خوان کو کسی درجے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امتی کا دستر خوان قرار دیا جا سکتا ہے؟

پھر یہی نہیں کہ یہ ابتدائی ایام کی بات ہو، آخری ایام تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول رہا، آپ اس دور میں بھی اس تکلف و تعیش سے دور رہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری اسلامی مملکت کے بلاشرکت غیر حاکم بن چکے تھے، فتوحات جاری تھیں اور ہر جانب سے مختلف مدات میں رقوم و اشیائے ضرورت کی آمد جاری تھی، اس سے ظاہر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسلوب زیست خود اختیاری تھا۔ اور دوسری جانب یہ امت کے لیے دیا جانے والا عملی درس بھی تھا۔

اسی طرح ایک دوسرے حاضر باش صحابیٔ رسول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

> توفی عنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یشبع من خبز الشعیر (۱)
>
> نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور آپ ﷺ نے کبھی جو کی روٹی بھی سیر ہو کر نہ کھائی۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں بھی یہ تصریح ملتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مسلسل دو دن جو کی روٹی سے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ (۲) یعنی کھجور وغیرہ

۱۔ بخاری: ج ۳، ص ۲۱۲

۲۔ بخاری

سے ہی پیٹ بھر لیا کرتے تھے۔

معیاری زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے کی جستجو میں سرگرداں اور دوسروں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ دینے کے خواہش مند کبھی اس جانب بھی غور کریں کہ کیا ہم اپنا معیار زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی (نعوذ باللہ) آگے لے جانا چاہتے ہیں؟ جب ہمارے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات میں بہترین اسوہ ہے، جب ہمارے لیے عملی طور پر آپ سے بڑھ کر کوئی آئیڈیل اور مثالی شخصیت ممکن نہیں تو ہمیں ترقی اور معیار زندگی کی بہتری کے لیے بھی اپنے خود ساختہ نظریوں کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر ہم اپنے نظریات خود سے تراش بھی لیں تو ان کی حیثیت بھی کیا ہے؟

گفت گو دعوتوں کے حوالے سے چل رہی ہے، اور دعوتوں میں شادی اور ولیمے کی دعوتیں سرفہرست ہیں، اس حوالے سے بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ملاحظہ کیجئے، ولیمہ ایک سنت نبوی ہے، اس بنا پر ہمارے لیے اس موقع پر زیادہ ضروری ہے کہ ہم تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اہتمام کریں۔ دوسری نوعیت کی دعوتوں میں بھی اور ولیمے وغیرہ کی دعوتوں میں خاص کر ایک فضا یہ بن رہی ہے کہ مسابقت اور مقابلے کا رجحان سامنے آرہا ہے، یہ صورت شریعت کی نظر میں کسی طور پر پسندیدہ نہیں ہوسکتی، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے خاص کر منع فرمایا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم مقابلہ کرنے والوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

اسی طرح آج کل کیا عرصے سے یہ رجحان سامنے آرہا ہے کہ اس نوعیت کی دعوتوں میں امرا کو تو اہتمام سے مدعو کیا جاتا ہے اور سماجی یا مالی اعتبار سے کم حیثیت کے افراد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، خواہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے یکسر خلاف ہے، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ ابوداؤد

شر الطعام طعام الولیمة یدعی لها الاغنیاء ویترک الفقراء (۱)

سب سے برا کھانا اس ولیمے کا کھانا ہے، جس میں امیروں کو تو مدعو کیا جائے اور غریبوں کو چھوڑ دیا جائے۔

کھانے پینے سے احتیاط اور اللہ کے رزق کو بے حرمتی سے بچانا اور اس میں اعتدال کی راہ اپنانا اسلامی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی رو سے تو ہم پر لازم ہے ہی خود صحت کے تقاضوں سے بھی ضروری ہے، سماجی و اخلاقی اقدار بھی ہمیں اس کی تلقین کرتی ہیں، اور ایک ذمے دار، با اخلاق و با کردار شہری کی حیثیت سے بھی ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنے ہاں رواج پانے والی اور عام ہو جانے والی غلط روایتوں کو دور کرنے میں اپنا کردار ادا کریں اور عملی طور پر اپنے حصے کی نیکیاں اس معاشرے کو دینے میں کسی قسم کی تاخیر اور بخل سے کام نہ لیں۔ اللہ ہماری مدد فرمائے، آمین۔

۱۔ بخاری: کتاب النکاح، باب من ترک الدعوة

عورتوں کی حدود کار

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ صحابیات رضی اللہ عنہن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاد اور دیگر فضیلتوں میں مرد ہم پر سبقت لے گئے، سو کیا ہمارے لیے کوئی ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ہم اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے مجاہدین کی فضیلت کو پا سکیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا مطالبہ سن کر فرمایا:

تم میں سے جو اپنے گھر میں بیٹھ رہے گی، وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے مجاہدین کے عمل جتنا ثواب پا لے گی۔(۱)

مرد ہو یا عورت دونوں کا اس کائنات میں حصہ مقرر ہے، ان دونوں کی حیثیت اپنے اپنے مقام پر کائنات کے ناگزیر حصے کی ہے، دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ان معنی میں ترجیح نہیں دی جا سکتی کہ ایک کو دوسرے سے زیادہ اہم یا زیادہ ضروری قرار دے کر دوسرے کی اہمیت کو کم کیا جائے، اختلاف ان دونوں میں صرف ساخت کا ہے، اسے حیاتیاتی فرق بھی قرار دے سکتے ہیں اور یہ فرق بالکل فطری ہے، اس قدر فطری کہ اس سے انحراف، فطرت سے انحراف کے مترادف ہے اور فطرت سے کیا جانے والا انحراف اپنا رنگ دکھا کر رہتا ہے اور مغرب کی موجودہ صورت حال جس میں ان کے لیے ہر آنے والا سورج عورتوں بل کہ پورے معاشرے کے لیے نت نئے مسائل کی نوید لا رہا ہے، اس انحراف اور اس کے بد اثرات کی واضح مثال ہے، مرد و عورت پر مبنی اس کائنات کو ان دونوں کے درمیان موجود تقسیم کار نے ہی توازن عطا کیا ہے اور یہ توازن اس وقت بگڑ جاتا ہے، جب اس کائنات میں عورت

۱۔ روح المعانی: ج ۶، ص ۲۲

و مرد کے وظیفہ حیات اور ان کے کردار کی حدود کو افراط و تفریط کا شکار کر دیا جاتا ہے۔

ان دونوں کے کردار کے بارے میں یہ غلط فہمی دراصل اس سبب سے پیدا ہوئی کہ مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کا عکس یا مثنیٰ (Duplicate) سمجھ لیا گیا یہ صریح طور پر غلط ہے، دونوں کی ساخت دونوں کی خوبیاں اور خصوصیات قطعاً یکساں نہیں، جو خصوصیات مرد کو حاصل ہیں وہ عورتوں کو نہیں اور جو امتیازات عورتوں کے پاس ہیں، ان سے مرد محروم ہیں۔ اس اعتبار سے دونوں جدا جدا خصوصیات کے حامل ہیں اور دونوں سے مل کر ہی تصویر مکمل ہوتی ہے اور اس حقیقت سے عورتوں کے اعزاز میں ان کی عزت و تکریم میں اس لیے کوئی کمی نہیں آ سکتی کہ اگر ایک بات عورت میں موجود نہیں ہے، تو دوسری بات مرد میں موجود نہیں ہے، اس لیے جب اس کمی سے مرد کی عزت کم نہیں ہوئی، تو عورت کی عزت کس طرح کم ہو سکتی ہے؟

اس تقسیم کار کے سبب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں گھر میں بیٹھ کر اپنے مفوضہ امور کی انجام دہی پوری امانت داری سے کرنے میں وہی عظیم الشان ثواب ملے گا جو مردوں کو جہاد جیسی پر مشقت اور فضیلتوں والی عبادت کو انجام دینے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، اب عورتوں سے ناانصافی کا سوال تو اس صورت میں پیدا ہوتا، جب مرد حضرات کو تو فضیلت جہاد حاصل ہو جاتی اور عورتوں کو نہ تو جہاد میں شرکت کی اجازت ہوتی، نہ انہیں اس کے متبادل کوئی دوسری فضیلتوں بھری عبادت ملتی، جو اُن ہی کے ساتھ خاص ہوتی۔

اسلام کی دعوت سے محروم خصوصاً اہل مغرب کے بہت سے مغالطے جدید سائنس اور عصر حاضر کی ضرورتوں اور نئے پیش آمدہ حالات نے خود ہی دور کر دیئے ہیں، عورتوں کے حوالے سے کئے جانے والے اعتراضات کا بھی کچھ یہی حال ہے، کل وہ معاشرہ جو عورت کو ہر اعتبار سے آزاد دیکھنے کا خواہش مند تھا، آج یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ اس آزادی کا نتیجہ سوائے فساد کے اور کچھ نہیں ہے، سو وہ ایک طویل سفر، جسے طے کر کے خواتین مغرب بھی آج اس منزل یقین پر پہنچی ہیں، بل کہ پہنچ رہی ہیں، کیا ہماری خواتین وہ لاحاصل سفر دوبارہ طے کرنا چاہتی ہیں؟ اور ہمارے مرد دانش ور بھی خواتین اسلام کو اسی شاہ راہِ گمان، اسی شاہراہِ اضمحلال پر پیادہ پا اور آبلہ پا دیکھنے کے خواہش مند ہیں؟ انصاف کا تقاضا اور دانش مندی کا مظاہرہ یہ ہے کہ آنکھوں سے نظر آنے والے حقائق پر عمل کیا جائے اور بالکل فرضی اور معروضی حالات

سے یک سر کٹے ہوئے تصوراتی خاکوں کو فراموش کر دیا جائے اور اس تجربے کو جو مغرب کے اس معاشرتی سانحے سے ہمیں حاصل ہوا ہے، کارآمد بنایا جائے۔

حقیقت وہی ہے جو آج سے چودہ سو برس پہلے بیان کر دی گئی تھی کہ عورت کا اپنا دائرہ کار ہے اور مرد کا اپنا، اوپر بیان ہونے والی روایت دوسرے مقام پر زیادہ تفصیل سے آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

> نسیبہ بنت عمر رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، مرد تو اجر و ثواب میں (ہم سے) سبقت لے گئے، وہ تو جمعہ کی نمازوں میں بھی شریک ہوتے ہیں، (دینی) اجتماعات میں بھی جاتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ میں بھی حصہ لیتے ہیں، پھر ہم عورتوں کے لیے کیا باقی رہا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے نسیبہ! ایک عورت اگر اپنے شوہر کے ساتھ بہترین طریقے سے رہے اور اس کی خواہشات کا خیال رکھے، یہ ان تمام اعمال کے برابر ہے، جن کا تم نے ابھی مردوں کے اجر و ثواب کے سلسلے میں ذکر کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام گھر کے اندر کے کام اور باہر کے کام کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھتا، دونوں کو برابر کی عزت دیتا ہے، اس لیے کہ دونوں کام یک ساں اہمیت کے حامل ہیں اور انسانی زندگی اور کائناتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے دونوں اہم ہیں، ان میں سے کسی فریق کو یہ حق نہیں کہ وہ احساس برتری میں مبتلا ہو، نہ کسی کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ احساس کم تری کا شکار ہو جائے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مرد و عورت کے مابین اختیارات کی یہ تقسیم فطرت کا تقاضا ہے اور اس پر نقل، عقل اور انسانی مشاہدات سب ہی متفق ہیں، اس لیے اس کائنات کا حسن اسی کو اختیار کرنے میں ہے، اس سے انحراف کی صورت میں فساد و انتشار کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔

حجاب کی حقیقت

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز وہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھیں کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوب رضی اللہ عنہ آگئے، یہ بڑے جلیل القدر نابینا صحابی تھے، انہی کے بارے میں تیسویں پارے کی تیسری سورت (۱) بھی نازل ہوئی تھی، انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں مدینہ منورہ میں آپ کی نیابت کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے، جب حجاب کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو آتے ہوئے دیکھا تو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ اور ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ تم دونوں پردے میں چلی جاؤ! حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ تو نابینا ہیں، وہ نہ تو ہمیں دیکھ سکتے ہیں، نہ پہچان سکتے ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

افعمیاوان انتما ألستما تبصرانه (۲)

کیا تم بھی نابینا ہو؟ اور تم بھی اسے نہیں دیکھ سکتیں؟

اسے ترمذی اور ابوداؤد کے ساتھ ساتھ مسند احمد میں بھی روایت کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کے بعد نہ تو کسی قسم کا ابہام باقی رہتا ہے، نہ کوئی شبہ برقرار رہتا ہے، بل کہ اگر اسے دیگر روایات اور قرآنی آیات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات

۱۔ سورۃ العبس

۲۔ ترمذی: ج ۴، ص ۳۵۷، رقم ۲۷۸۷

واضح ہو جاتی ہے کہ حجاب میں، جس کی ضرورت وفرضیت کے باب میں سب ہی متفق ہیں، چہرہ نہ صرف شامل ہے بل کہ اس کا سب سے ضروری اور اہم حصہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ کافی اہمیت کا حامل ہے، غزوۂ احد کے موقع پر ام خلاد نامی ایک خاتون کا بیٹا شہید ہو گیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کے اجر وثواب کی بابت استفسار کیا، اس نے اس موقع پر اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا تھا، لوگوں نے ازراہ حیرت اس سے سوال کیا کہ تمہارا بیٹا شہید ہو گیا ہے اور تم نے چہرے پر نقاب ڈالی ہوئی ہے؟ ان کا مقصد یہ تھا کہ جوان العمر بیٹے کے سوگ میں تمہیں سر اور چہرہ نہیں ڈھانپنا چاہیے تھا، اس صحابیہ خاتون کا جواب بڑا ایمان افروز تھا، اس نے کہا:

ان ارزا ابنی فلن ارزا حیائی

اگر میں نے بیٹا گم کر دیا ہے تو حیا تو ہرگز گم نہ کر دوں گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

ابنک لہ اجر شہیدین

تیرے بیٹے کو دو شہیدوں کا اجر ملا ہے۔

ام خلاد نے سوال کیا کہ اس دہرے اجر کا کیا سبب ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

لانہ قتلہ اہل الکتاب (۱)

کیوں کہ اسے عیسائیوں نے قتل کیا ہے۔

اس روایت میں بہت سے پہلو ہمارے لیے لائق توجہ ہیں:

ایک تو یہ کہ پردہ اس دور میں رائج تھا، نہ صرف رائج تھا بل کہ مسلمان کی پہچان اور حیا کی علامت تصور کیا جاتا تھا، ورنہ جن لوگوں نے اس کے نقاب پر حیرت ظاہر کی وہ یہ نہ کہتے کہ صدمے کی حالت میں بھی تم نے پردہ کیا ہوا ہے، بل کہ ان کا اعتراض یہ ہوتا کہ تم نے یہ چہرے کے چھپانے کا مسئلہ کہاں سے لیا؟ اسلام میں تو یہ شرط نہیں ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ

۱۔ ابوداؤد: ج ۲، ص ۳۴۰، رقم ۲۴۸۸

علیہ وسلم نے بھی خاموش رہ کر اس کے اس عمل کو قبولیت کی سند دی اور تقریر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ تقویت پا کر شریعت مطہرہ کی دلیل اور نص صریح بن گیا۔

قرآن کریم میں تو یہ مسئلہ بہت واضح ہے، جس میں صاف طور پر عورت کے چہرے سمیت تمام مظاہر زینت کو نامحرم مردوں سے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے، مثال کے طور پر سورۂ احزاب میں فرمایا گیا:

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ ط (۱)

اور جب تم پیغمبر (علیہ الصلاۃ والسلام) کی بیویوں سے کچھ سوال کرو تو پردے کے پیچھے سے کرو۔

پھر اسی آیت میں اس حکم کا سبب اور وجہ بھی بیان فرمادی:

ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ط (۲)

یہ حجاب تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے پاکیزگی کا بہترین ذریعہ ہے۔

اسی سورۂ احزاب میں دوسرے مقام پر فرمایا:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (۳)

اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح اپنی زیب و زینت کا اظہار نہ کرو۔

صرف یہی نہیں کہ خواتین کے لیے حجاب کا حکم ہے بل کہ ہر اس کام کی ممانعت کی گئی جو ان کی طرف مردوں کے ادنیٰ میلان کا بھی سبب بنتا ہو۔ مثال کے طور پر سورۂ نور میں خواتین کو یہ حکم دیا گیا:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ ط (۴)

---

[۱] ۔ الاحزاب: ۵۳

[۲] ۔ الاحزاب: ۵۳

[۳] ۔ الاحزاب: ۳۳

[۴] ۔ النور: ۳۱

اور عورتیں اپنے پاؤں (زمین پر) زور زور سے مار کر نہ چلیں، کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے۔

یعنی پیروں کے چلنے کی آواز سے بھی اگر کسی کے متاثر ہونے اور اس جانب متوجہ ہونے کا امکان یا خدشہ ہو تو اس سے بھی بچنے کا حکم ہے اسی لیے یہ عام حکم ہے کہ پیر آہستگی سے زمین پر رکھیں اور اپنی چال کو دھیما رکھیں، تاکہ ان کی آواز پیدا نہ ہو۔ اسی آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس عورت کے لیے ہر ایسی حرکت ممنوع ہے، جس سے اس کی چھپی ہوئی زینت کا اظہار ہوتا ہو، یہاں تک کہ اسے عطر اور خوش بو لگا کر گھر سے باہر نکلنا بھی ممنوع ہے۔(۱)

ہمارے لیے یہ مقام تفکر ہے کہ خواتین کے لیے صرف خوشبو لگانا بھی منع ہے، یعنی اگر چہرہ کھلا ہوا نہ ہو، بل کہ شرعی حجاب میں مستور ہو، تب بھی انھیں خوش بو لگانے کی اجازت نہیں کہ وہ بھی غیر مردوں کو متوجہ کرنے کا باعث بن سکتی ہے، سو ایسے میں چہرے ہی کو کھولنے کا حکم یا اجازت دے دی جائے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟

اصل میں یہ سوالات اسلام کے مزاج کو اس کی اہمیت کے مطابق نہ سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں، اسلام کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ وہ ہر برائی کو پیدا ہونے سے قبل ہی ختم کر دینے کا قائل ہے، وہ نہ صرف برائی پنپنے نہیں دیتا، بل کہ وہ ہر اس رخنے کو ٹھکرا دینے کا قائل ہے، جہاں سے کسی بھی وقت اور کسی بھی صورت برائی داخل ہو سکتی ہے، پردہ اور حجاب بھی اس سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ پردہ بذاتِ خود کوئی مطلوب نہیں، لیکن چوں کہ وہ ایک بہت ہی بڑی برائی سے بچنے کے لیے ضروری ہے، اس لیے اس کا حکم اس شدومد سے دیا جاتا ہے۔ پھر اس مقصد کے لیے چہرہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے، اس لیے یہ ہدایت لازمی طور پر اور سب سے پہلے حکم حجاب میں شامل ہوگی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسان کو پورے جسمِ انسان میں خوب صورتی اور حسن کے

۱۔ تفسیر ابن کثیر: ج ۲، ۲۸۵

اعتبار سے کون سا عضو سب سے پہلے متاثر کرتا ہے اور اپنی جانب مائل کرنے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے؟ کیا وہ انسان جو عورت کے جسم سے اٹھنے والی خوش بو سے متاثر ہوسکتا ہو، جسے عورتوں کے چال اور ان کے قدموں کی آواز اپنی جانب مائل کر لیتی ہو، جیسے عورت کے جسم کے دیگر حصے مثلاً پیر وغیرہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہوں، اسے عورت کا چہر متاثر نہیں کرے گا؟ وہ جب کسی خوب صورت چہرے کو دیکھے گا تو اس کے جذبات میں کسی قسم کا ارتعاش پیدا نہیں ہوگا؟ کیا استدلال تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

اسی سوال کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھا جاسکتا ہے، آرائش وزیبائشِ حسن کے لیے جو اقدامات عصرِ حاضر میں رائج ہیں اور خصوصاً بیوٹی پارلرز جن پر خصوصی توجہ دیتے ہیں، ان میں اولیت اہمیت اور ترجیح کس چیز کو حاصل ہے؟ کیا سب سے زیادہ وقت، سب سے زیادہ دولت اور سب سے زیادہ صلاحیت چہرے کی نگہ داشت اور اس کی زیبائش پر صرف نہیں ہوتی؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو پھر چہرے کو کس بنیاد پر حجاب کی تعریف اور اس کے حکم سے خارج کیا جاسکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہمیں غور وفکر کی توفیق اور فہم سلیم عطا فرمائے۔ آمین

بچوں سے تعلق

بچے معاشرے کا حسن اور اس کا مستقبل ہیں۔ بچوں اور نونہالوں کی اس حیثیت کو سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جناب رسول اکرم ﷺ نے بچوں کی اہمیت کو ہمارے قلبی اور نفسیاتی رویوں سے بڑھ کر سمجھایا ہے، اور ان کی حیثیت واضح کی ہے۔ سیرت کے صفحات میں بچوں کے حوالے سے ایک دل چسپ واقعہ محفوظ ہے، راوی اس کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک دن آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہو کر جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ اس آپ ﷺ کے دونوں نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دوڑتے اور لڑکھڑاتے ہوئے تشریف لائے۔ آں حضرت ﷺ نے خطبہ روک دیا۔ پھر منبر سے اتر کر دونوں بچوں کے پاس تشریف لے گئے۔ انہیں نہایت محبت سے گود میں اٹھایا اور منبر پر تشریف لا کر فرمایا:

> اے لوگو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہاری لیے شیفتگی کا باعث ہیں۔ میں نے اپنے دونوں بچوں کو دوڑتے اور لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو میں خود پر قابو نہ پا سکا اور نیچے اتر کر انہیں گود میں لے لیا۔

یہ ایک واقعہ نہیں، ایک درس ہے، جس میں محبت بھی ہے، شفقت بھی ہے، لطف اور نرمی بھی ہے، یوں ہماری تربیت کا اس میں بہت سامان موجود ہے۔

ایک اور واقعہ دیکھیے: ایک روز رسول اللہ ﷺ عبادت میں مصروف تھے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تشریف لائے۔ جب حضور ﷺ سجدے میں گئے تو دونوں آپ ﷺ کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔ آپ ﷺ اسی کیفیت میں سجدے کی حالت میں کافی دیر تک رہے، مگر ان دونوں کو ہٹانا گوارا نہیں فرمایا، حتیٰ کہ جب وہ دونوں خود ہی نیچے اتر گئے، تب

آپ سجدے سے اٹھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام پھیر کر نماز ختم کی تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ سجدے میں اتنی تاخیر کیوں ہوگئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

میرے دونوں بچے میری پیٹھ پر سوار ہو گئے تھے اور میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ دونوں کو نیچے اتار دوں۔(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت شفقت صرف اپنے عزیز بچوں تک محدود نہیں تھی، آپ تو ہر بچے کو مستقبل کی امید اور اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اس کا خاص خیال فرماتے تھے، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عام بچوں پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب راستے میں کھیلنے والے بچوں پر آپ کا گزر ہوتا تو آپ خود انہیں سلام کیا کرتے تھے اور مسکرا کر ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔(۲) اور اگر سواری پر سوار ہوتے تو بچوں پر مزید شفقت فرماتے ہوئے انہیں سواری پر اپنے ساتھ سوار کر لیتے تھے۔(۳)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بچوں پر شفقت اور محبت اور بھی بہت سی صورتوں میں ہماری سامنے آتی ہے۔ آپ نے ایک بار فرمایا کہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا خیال ہوتا ہے کہ میں لمبی نماز پڑھوں مگر نماز کے دوران کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں نماز کو چھوٹا کر دیتا ہوں، کیوں کہ مجھے یہ بات ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ اس کی ماں پر سختی کی جائے۔(۴)

دیکھیے عبادت اللہ کے دربار میں حاضری کا نام ہے، اس کیفیت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حاضری کو مختصر کرنا گوارا کر لیتے ہیں، مگر کسی بچے کے آنسو آپ کو گوارا نہیں، نہ اس بچے کی وجہ سے اس کی ماں کا تڑپنا اور پریشان ہونا آپ کو پسند ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی نواسی امامہ بنت زینبؓ اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بے

۱۔ اسلام میں بچے کی نگہداشت: ص ۲۳

۲۔ مسلم: ج ۳، ص ۱۴۰۴، رقم ۲۱۶۸

۳۔ مسلم: ج ۴، ص ۹۷، رقم ۲۴۲۸

۴۔ بخاری: ج ۱، ص ۱۷۱، رقم ۷۰۷

حد محبت تھی۔ ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ نے حضرت حسنؓ کو بوسہ دیا۔ اس وقت آپ کے پاس اقرع بن حابس تمیمی موجود تھے، انہوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا کہ میرے دس لڑکے ہیں، میں نے تو ان میں سے کسی کو کبھی نہیں چوما، آپ نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا (اس پر) رحم نہیں کیا جاتا۔ (۱)

اور دوسری روایت میں فرمایا کہ اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم نکال دیا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ (۲)

یعنی یہ محبت فطری امر ہے، اگر کوئی دل اس سے محروم ہے، تو وہ فطرت سے دور ہے، اور اپنی اصل سے ہٹ چکا ہے۔

بچوں سے ہمارے رویے افراط و تفریط کا شکار ہیں، ہم انہیں اپنا مستقبل قرار دیتے ہیں، مگر اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے کچھ خرچ کرنے کو تیار بھی نہیں ہوتے، یا اگر مالی طور آسودہ گھرانوں کو دیکھا جائے تو وہ تربیت اور تعلیم صرف پیسے کے بے محابا خرچ کرنے کو سمجھتے ہیں، اچھی سواری میں اچھے لنچ بکس اور اچھے اور بھاری جیب خرچ کے ساتھ بچوں کو اچھے اسکول بھیج دینا اپنی ہر نوع کی ذمے داری کی ادائیگی کے لیے کافی تصور کرتے ہیں یا مہنگی اور تربیت یافتہ آیا کو بچوں کی نگہ داشت پر مامور کر کے فطرت کی جانب سے دی گئی ذمے داریاں سے اپنے آپ کو سبک دوش تصور کر لیتے ہیں اور دنیا کی چمک میں کہیں گم ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بچہ صرف اچھے تعلیمی ماحول سے نہیں سیکھتا، اس کی صحت اور نشو و نما کے لیے بھی صرف اچھی اور زیادہ تنوع والی خوراک کافی نہیں، وہ تو کل وقتی توجہ چاہتا ہے، اور تعلیم ہو یا تربیت یہ دونوں کل وقتی کام ہے، جس کا سب سے اہم حصہ والدین ہیں، جو آج کے دنیا میں سب سے کم حصہ ادا کر رہے ہیں، اور جو بچے کی تربیت کے اچھے اور منفی دونوں نوعیت کے پہلوؤں سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ کسی اچھے تربیت یافتہ بچے کی اچھائیاں بھی سب سے پہلے والدین کے حصے میں آئیں گی اور برائیاں بھی۔ اس لیے اس ضمن

۱۔ بخاری: ج ۱۴ ص ۸۶، رقم ۵۹۹۷

۲۔ بخاری: ایضاً رقم ۵۹۹۸

میں والدین کی توجہ امرِ واقعی ہے، اور یہ توجہ محبت کا لازمی عنصر ہے۔

بچوں کی تربیت کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ بچہ صرف تعلیم سے نہیں سیکھتا، وہ ماحول، معاشرت، رکھ رکھاؤ، برتاؤ اور اپنے محبت کرنے والوں کے لمس سے بھی سیکھتا اور ان تمام چیزوں سے اپنی ذہنی وجسمانی نشوونما پاتا ہے۔ یہ پہلو ہمیشہ ہمارے مدِ نظر رہنا چاہیے۔ اور بچوں کے ساتھ اپنے رویے اور برتاؤ کو ان ہی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

دعوت کا اسلوب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ اپنے صحابہؓ کے ہمراہ کسی سفر سے واپسی پر مدینہ منورہ کے کسی راستے سے گزر رہے تھے، راستے میں ایک چھوٹے کانوں والا بکری کا بچہ مردہ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے کان پکڑے اور فرمایا:

ایکم یحب ان ھذہ لہ بدرھم؟

تم میں سے کون یہ پسند کرے گا کہ یہ بکری کا بچہ اسے ایک درہم کے بدلے مل جائے؟

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ ہم اسے کسی قیمت پر بھی خریدنا پسند نہیں کریں گے، یہ تو ہمارے کسی کام کا نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر پوچھا:

کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ یہ بکری کا بچہ تمہیں مل جائے؟

صحابہؓ نے پھر عرض کیا کہ اگر یہ زندہ بھی ہوتا، تب بھی اس میں یہ عیب تھا کہ اس کے کان چھوٹے ہیں، اور اب تو یہ ویسے بھی مردہ ہے۔

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فو اللہ للدنیا اھون علی اللہ من ھذا علیکم۔(۱)

خدا کی قسم! بکری کا یہ مردہ بچہ تمہاری نظر میں جتنا بے قیمت ہے، دنیا اللہ کی نظر میں اس سے بھی زیادہ بے قدر و قیمت ہے۔

۱۔ مسلم: ج۴، ص ۲۲۸۰، ۲۹۵۷

رسول اکرم ﷺ کا یہ اسلوب صرف اس موقع پر ہی نہ تھا، بل کہ یہ آپ کا عام انداز تھا، آپ ﷺ موقع اور محل کی مناسبت سے کلام فرماتے تھے، اور اپنی گفت گو میں ماحول اور موقع کی رعایت سے ایسے نکتے پیدا فرما دیتے تھے کہ سننے والے ان سے محظوظ بھی ہوتے اور بات اُن کے ذہن میں جگہ بھی بنا لیتی، یوں عمل کی راہ اُن کے لیے آسان تر ہو جاتی تھی۔

ایسے ہی ایک اور موقع کا ذکر ہے، رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ قیدی لائے گئے، قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی، اس عورت کو قیدیوں میں ایک بچہ نظر آیا۔ اُس نے شدتِ جذبات اور فرطِ محبت سے مجبور ہو کر اس بچے کو گود میں لے لیا اور اسے دودھ پلانے لگی۔ نبیِ اکرم ﷺ اس منظر کو اپنے صحابہؓ کے ہمراہ دیکھ رہے تھے، آپ نے صحابہ کرامؓ کے انداز سے محسوس کیا کہ وہ اس منظر سے متاثر ہیں، آپ ﷺ نے اس موقع کو مناسب جانا اور صحابہؓ سے پوچھا:

اترون هذهٖ طارحة ولدها فی النار؟

تمھارا کیا خیال ہے، کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: نہیں، یہ عورت ہرگز ایسا نہیں کر سکتی۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

اللہ ارحم بعبادہ من هذه بولدها (۱)

یہ عورت اپنے بچے پر جس قدر مہربان ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔

ملاحظہ کیجیے، صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں بچے پر ماں کی شفقت کا تصور ایک منظر دیکھ کر نمایاں ہوا، آپ ﷺ نے اس چیز کو بنیاد بنا کر اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ کی بندوں پر محبت کے تصور کو اُن کے ذہنوں میں راسخ فرما دیا، یہی بات کسی اور موقع پر کی جاتی، یا اس کے یہ برمحل تمثیل نہ ہوتی تو صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں اس کا تاثر وہ نہ بنتا جو اس موقع پر بنا، یہ بات سمجھانے کے لیے آپ ﷺ کو شاید پورے ایک طویل وعظ کی ضرورت ہوتی، مگر یہاں پر

۱۔ مسلم: ج ۴، ص ۲۱۰۹، ۲۷۵۴

ایک جملہ ہی مفید اور کافی ثابت ہو گیا، صرف موقع اور محل کی مناسبت نے یہ کام انجام دیا۔

درحقیقت ایک پیشوا، مقتدی، یارہ نما اور مربی کی یہ ذمے داری ہے کہ اصلاح کے لیے ایسے طریقے اختیار کرے جو لوگوں کے لیے دل چسپی کا باعث بنیں، وہ مقصد کے قریب آئیں، وہ مربی کے مفہوم کو جلد سمجھ سکیں، نہ کہ ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جو لوگوں کو برگشتہ کرنے کا سبب بنے، لوگ بات سننا ہی پسند نہ کریں، یا سنیں تو ایسے انداز میں کہ اُن کی دلچسپی اس بات میں قائم نہ ہونے پائے۔ لوگوں کو متوجہ کرنا ضروری ہے مگر اس کے لیئے اُن کی نفسیات اور ان کے ذہنوں کو پڑھنا بھی از حد ضروری ہے، اسی بنا پر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اکتا دینے والے وعظ سے بھی منع فرمایا۔

اس بات سے ہمیں یہ درس بھی ملتا ہے کہ کسی بھی داعی میں دعوت کا داعیہ کس قدر پختہ ہونا چاہیے؟

درحقیقت دعوت کوئی جز وقتی کام نہیں ہے، نہ یہ کسی خاص صورتِ حال، ماحول اور انداز کے ساتھ مشروط ہے، یہ ایک کل وقتی عمل ہے، داعی تو موقع کی تلاش میں رہتا ہے، اور جب قدرت کی طرف سے یہ موقع ہاتھ آجائے تو پھر وہ چوکتا نہیں، وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھاتا ہے۔

مگر دعوت کے لیے حکمت سے موقع شناسی اور سامعین کی نفسیات کا لحاظ بہت ضروری ہے، ورنہ یہی نیک کام نقصانات اور مفاسد کا سبب اور سامعین کو متنفر کرنے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

پھر دعوت کوئی مخصوص شعبہ نہیں، نہ یہ پیشہ ور قسم کے کا کوئی کام ہے، ہر شخص داعی ہے، اپنی اپنی ضرورت اور ماحول کے مطابق، گھر سے لے کر دفتر تک اور دکان سے لے کر بازار تک، ہر شخص کو اس کے ان گنت مواقع ملتے ہیں، یہ اب ہم پر ہے کہ کس موقع کو کس خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں، اس میدان کی شرط صرف یہ ہے کہ جو بات بھی سمجھانا چاہتے ہیں اس کا صحیح علم ہمارے پاس موجود ہو اور ہم وہ دلِ دردمند رکھتے ہوں جو پورے سوز کے ساتھ دعوتی لطافتوں کا بھی حامل ہو۔

خطیبوں کے لیے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فصاحت و بلاغت میں کسے کلام ہوسکتا ہے؟ عربی جیسی فصیح اور وسیع زبان آپ کی مادری زبان تھی، پھر عربوں کے ہاں بھی دو قبیلے اس شعبے میں خصوصیت کے ساتھ شہرت اور امتیاز کے حامل تھے، قریش اور بنوسعد، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے دونوں قبائل کی خوبیوں سے آپ کو متصف فرمایا، قریش تو آپ کا اپنا قبیلہ تھا اور بنوسعد میں آپ کی پرورش ہوئی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انا افصح العرب، بیدانی من قریش و نشأۃ فی بنی سعد (۱)

میں عرب کا فصیح ترین شخص ہوں، کیوں کہ میں قریش میں پیدا ہوا اور میں نے بنو سعد میں پرورش پائی ہے۔

ایک بار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم نے آپ سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ومایمنعنی و انما انزل القرآن بلسانی لسان عربی مبین (۲)

میری فصاحت میں کیا رکاوٹ ہوسکتی ہے، جب کہ قرآن میری زبان یعنی کھلی اور واضح عربی زبان میں نازل ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام اور آپ کی خطابت کی تعریف کرتے ہوئے مصطفی صادق رافعی کہتے ہیں:

۱۔ قاضی عیاض۔ الشفاء: ج ۱، ص ۷۴

۲۔ ایضاً

پختہ اندازِ ادا، شانِ فصاحت، حلاوتِ کلام اور اسلوب کی سلاست سمیت کوئی ایسی صفت نہ ہوگی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں طبعی وفطری طور پر موجود نہ ہو، آپ ﷺ نے نہ تو ان کے لیے محنت ومشقت کی تھی نہ ریاضت کی تکلیف اٹھائی تھی، بل کہ آپ ﷺ فطری طور پر ان اوصاف میں کامل پیدا ہوئے تھے۔(۱)

جب کہ قاضی عیاض فرماتے ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فصاحت زبان اور بلاغت کلام میں ایسے بلند مقام اور اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے جہاں سلاست طبع، فصاحتِ کاملہ، ایجاز، موزوں الفاظ کا انتخاب، جزالت کلام، صحت معانی اور قلت تکلف، کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم بھی عطا کیے گئے تھے اور نادر حکمتوں کے ساتھ آپ مخصوص کیے گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب کی تمام (مختلف) زبانیں سکھا دی تھیں، اور آپ ہر قوم سے اسی کی زبان میں خطاب فرماتے تھے اور اسی قبیلے کے محاورے میں گفت گو فرماتے تھے۔ (۲)

نبی اکرم ﷺ کی خطابت عام عرب رواج سے بہت ہٹ کر تھی، ایک تو اس میں مقصدیت کو اولیت حاصل تھی، اس لیے وہ خطابت برائے خطابت نہ تھی۔ پھر آپ ﷺ کا مقام اور پیغام اس قدر بلند تھا کہ آپ ﷺ کے کلام اور خطابت میں خیر خواہی کا عنصر ہر دوسری چیز پر فوقیت رکھتا، اس لیے اس کی جانب سامعین کا کھنچے چلے آنا بدیہی امر تھا۔ پھر عربوں کے ہاں ذاتی توصیف اور قبائلی مفاخرت کے جذبات غالب تھے، آپ ﷺ نے ان چیزوں کا خاتمہ کر دیا اور خطابت کو حق وصداقت کی آواز بنا دیا۔ اس کے علاوہ علم وعمل کے بُعد کو بھی آپ ﷺ نے اپنے کردار اور فعل کے ذریعے ختم کر دیا، آپ ﷺ نے دوسروں کو جو تلقین کی خود اس سے بڑھ کر اور اس سے پہلے اس پر عمل پیرا ہو کر دکھایا، جس کا نتیجہ یہ نکلا

۱۔ الرافعی، مصطفیٰ صادق۔ اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویہ: ص ۲۹۷

۲۔ قاضی عیاض۔ الشفاء: ج ۱، ص ۴۴

کہ چند برسوں کے اندر اندر ہی پورا عرب میز عرب کے پیغام کے زیر نگین آ گیا، صلی اللہ علیہ وسلم۔

ایسے میں ہمارے لیے غور و فکر کا مقام ہے کہ آپ ﷺ کے طرزِ تخاطب اور اسلوب خطابت کا قریب سے جائزہ لیں اور اس میدان میں آپ ﷺ نے ہمارے لیے جو اسوۂ حسنہ چھوڑا ہے، اس پر عمل پیرا ہوں، تا کہ یہ سنتِ نبوی پھر سے زندہ ہو اور پیغام حق اور دعوت الٰہی پھر سے اطراف و اکناف عالم میں پھیل جائے، جو اسلام کا ہم سے اولین مطالبہ بھی ہے اور موجودہ حالات کا شدید ترین تقاضا بھی۔ ادھر ہمارے لیے یہ امر بھی باعث تقویت اور ہماری صلاحیتوں اور کاوشوں کے لیے مہمیز کا درجہ رکھتا ہے کہ آج صورت حال بھی اس مقصد کے لیے حد درجہ سازگار ہے۔

آپ ﷺ کی بعثت سے قبل عرب میں خطبا کے ہاں جو اسلوب رائج تھا، اس کے مطابق وہ باچھیں کھول کر اور ہاتھ پیروں کو بہت مبالغے کے ساتھ ملا کر خطاب کیا کرتے تھے، غالباً ان حرکات سے مجمع کو مرعوب کرنا اور ان پر اثر انداز ہونا مقصود ہوتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں سے سختی سے منع فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

كان يكره التصنع كله، كان يعرض عن كل كلام قبيح

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے تصنع کو ناپسند فرماتے تھے اور ہر طرح کے قبیح کلام سے اعراض فرماتے تھے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

ان الله يبغض البليغ من الرجل الذى يتخلل بلسانه كما تتخلل البقرة(۱)

یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے بلیغ آدمی سے بغض رکھتا ہے جو ایسے چرتا ہے جیسے گائے چرتی ہے۔

امام ادب جاحظ نے رسول اکرم ﷺ کے کلام گفت گو اور خطابت کا نہایت جامعیت

۱۔ ترمذی: ج ۴، ص ۳۸۸، رقم ۲۸۶۲

کے ساتھ عمدہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے، جس سے ہمیں کافی رہ نمائی مل سکتی ہے اور اپنے معاملات کو درست نہج پر استوار کرنے کے لیے ہدایت کی روشنی حاصل ہوتی ہے، اس لیے یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ جاحظ لکھتا ہے:

> آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف حکیمانہ گفت گو فرماتے اور معصوم کلام کرتے، طویل بات کو مختصر الفاظ میں ادا فرما دیتے، مقابل کو صرف ایسی دلیل سے خاموش کراتے جس سے وہ آ گاہ ہو، اور گفت گو میں حق کے ذریعے دوسروں پر غلبہ حاصل کرتے، کسی کو دھوکہ نہ دیتے، کسی کو شک میں نہ ڈالتے، لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے زیادہ نفع بخش، الفاظ کے اعتبار سے صادق، وزن کے اعتبار سے قابل اعتبار، جمیل المذہب، عمدہ مطالب والا، موقع کے اعتبار سے احسن، ادائیگی کے لحاظ سے سہل، معنیٰ کے لحاظ سے فصیح اور مقصود کے اعتبار سے واضح کلام نہیں سنا۔(۱)

جاحظ کی طرف سے اٹھائے جانے والے نکات پر اگر ہم غور کریں تو ہمارے لیے عبرت کا بہت سا سامان ان میں پوشیدہ ہے، آج ہمارے خطیب (الا ماشاء اللہ) کم وبیش ان ہی کم زوریوں کا شکار ہیں، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ حسن صوت ایک ضروری اور محمود صفت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے بہ کمال وتمام متصف تھے، مگر آواز کے اتار چڑھاؤ کو ہی مقصد بنا کر اور اسے بنیاد قرار دے دینا، پھر آواز بنانا، اسے گھمانا یہ سب باتیں مکروہات خطابت میں آتی ہیں، اسی طرح تہذیب وشائستگی سے باہر نکلنے والی حرکات کرنا بھی مکروہات میں شامل ہے، اگر خطیب کا بنیادی مقصد اصلاح ہے، تو اس قسم کی حرکات کرنے والا خطیب اپنے عمل سے اپنے سامعین کو کیا پیغام دے رہا ہے؟ قول وفعل کا تضاد تو آج کے دور میں معمولی نوعیت کا جرم بن گیا ہے، مگر اپنے پیغام کی حقانیت اور اپنے عقیدے پر غیر متزلزل اعتماد ہم میں سے کس کو حاصل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے عام طور پر مختصر مگر نہایت جامع ہوتے تھے، لیکن آج طویل ترین خطبوں کو تہہ میں جا کر ٹٹولیے تو کام کے چند جملے بھی

۱۔ جاحظ۔ البیان والتبیین: ج ۲، ص ۱۳

مشکل ہی سے ہاتھ آئیں گے۔

عربوں کے ہاں دورِ جاہلیت میں خطابت عموماً ذاتی، شخصی، قبائلی اور قومی مفاخرت کے گرد گھومتی تھی، آج ہمارے ہاں اس کی جگہ ذاتی اور جماعتی مفاخرت نے لے لی ہے، رہی سہی کسر گروہی اور مسلکی مفاخرت نے پوری کردی ہے۔ تبلیغ و دعوت دین، اعلائے کلمۃ الحق اور اصلاح نفوس کا اصل میدان ہمارے سامنے ہے ہی نہیں۔

اگر ہمارا اس امر پر ایمان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں ہمارے لیے ہر شعبہ زندگی میں رہ نمائی و روشنی عطا کرنے والا اسوۂ حسنہ موجود ہے تو اس شعبے میں بھی ہمیں از سرِ نو اپنی ترجیحات، مقاصد اور اسلوب و انداز کا جائزہ لے کر اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر انہیں مرتب کرنا ہوگا۔ ہر سطح پر اس شعبے سے وابستہ افراد کے انفرادی طور پر کرنے کا کام ہے اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس شعبے میں بھی قرآن و سنت اور حدیث و سیرت میں ہماری رہ نمائی کا مکمل سامان موجود ہے۔

استقبالِ رمضان المبارک

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں رمضان المبارک کے عظیم اور بابرکت مہینے کی آمد اور اس کے مقام اور اہمیت کے متعلق صحابہ کو تعلیم دی، ہم آمدِ رمضان کے موقع پر آج کی نشست میں اسے اپنے قلوب واذہان میں تازہ کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> اے لوگو! تمہارے اوپر ایک عظیم اور بابرکت مہینے سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینے کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض کیے ہیں، اور اس کی راتوں میں قیام (تراویح) کو نفلی عبادت مقرر کیا ہے، جو شخص اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض عبادت (سنت، نفل) ادا کرے گا، تو اس کو رمضان کے علاوہ دوسرے ایام کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا، اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب رمضان کے علاوہ اور ایام کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے، اور اس مہینے میں مومنوں کے رزق میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، جس نے اس مہینے میں کسی روزے دار کو اللہ کی رضا اور ثواب کے حصول کی نیت سے افطار کرایا تو اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا، اور اس کو روزے دار کے ثواب میں سے کوئی کمی کیے بغیر روزے دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔

حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی ثواب عطا فرمائے گا جو ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ پر یا لسی کے ایک گھونٹ پر کسی روزے دار کو روزہ افطار کرا دے۔ یہ ایسا مبارک مہینہ ہے، جس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ دوزخ سے نجات ہے، جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام (ملازم، خادم) کے کام میں تخفیف کرے گا اللہ اس کی مغفرت فرمائے گا، اور اسے دوزخ سے آزادی کر دے گا، اس مہینے میں تم چار خصلتوں کے لیے خوب کوشش کرو، دو خصلتیں وہ ہیں جن سے تمہارا رب راضی ہوگا اور دو خصلتیں وہ ہیں جن سے تم بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

دو وہ خصلتیں جن سے تمہارا رب راضی ہوگا یہ ہیں: ۱۔ اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں: ۲۔ اور اللہ سے گناہوں کی معافی مانگنا۔

اور دو خصلتیں جن سے تم بے نیاز نہیں رہ سکتے یہ ہیں: ۳۔ اللہ سے جنت کا سوال کرنا۔ ۴۔ دوزخ سے پناہ مانگنا، اور جس شخص نے کسی روزے دار کو پلایا تو اللہ اسے میرے حوض (حوضِ کوثر) سے ایسا مشروب پلائے گا جس کے پینے کے بعد اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی، یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔(۱)

غور کیا جائے تو اس روایت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمودہ اس طویل خطبے میں ہمارے لیے رمضان المبارک کے حوالے سے جامع ہدایات موجود ہیں، چند نکات کا ذیل میں جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد اور خطبے کا آغاز رمضان المبارک کی عظمت کے بیان سے ہوتا ہے۔ آپ کے خطبۂ مبارکہ کا پہلا پیغام یہ ہے کہ یہ ماہِ مبارک سال کے دیگر گیارہ مہینوں کی مانند نہیں ہے، جس کے نہ آنے سے ہمارے معمولات میں کوئی تغیر آتا ہے، نہ

۱۔ الترغیب والترہیب: ج ۲، ص ۲۱۸

جن کے رخصت ہونے پر ہماری زندگی اور شب و روز کے معاملات تبدیل ہوتے ہیں، بل کہ یہ مہینہ اُن سے ہٹ کر ہے، اس لیے اس کے آغاز پر ہمارا رویہ بھی عام معمول سے ہٹ کر ہونا چاہیے۔ یہ عظیم مہینہ ہے، یہ برکتوں والا ہے، خصوصاً اس میں ایک ایسی رات بھی پوشیدہ ہے، جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس ماہِ مبارک کے عشرۂ آخر کی طاق راتوں میں پوشیدہ ہے، جس کو تلاش کرنے اور اس میں عبادت کرنے کی تاکید اور حکم ہے، یہ رات اس امت کی خصوصیات میں سے ہے، جس سے دوسری کسی امت کو نہیں نوازا گیا۔

۲۔ اس مہینے کا خاص وظیفہ دو عبادتیں ہیں، دن کے اوقات میں روزہ اور اس کی شب میں تراویح، یہ دونوں عبادتیں اس معنی میں اسی ماہ مبارک کے ساتھ خاص ہیں کہ دیگر ایام میں ان کی حیثیت نفل سے زیادہ نہیں، اس لیے ان کی ادائیگی کے لیے خاص سرگرمی، خاص ذوق و شوق اور خاص دل چسپی کا مظاہرہ ایمان کا تقاضا ہے۔

۳۔ اس مہینے کی برکات بے شمار ہیں، اور اس کے فضائل بیش بہا، جن میں سے ایک بہت بڑی برکت یہ بھی ہے کہ اس میں عبادت کے درجات اور اس پر ملنے والا اجر اور انعام بڑھا دیا جاتا ہے، اور کسی شرح سے؟ اصل سے ستر گناہ زیادہ، اور اس مہینے کا نفل عام ایام کے فرض کے برابر ثواب اور قدر و قیمت رکھتا ہے، جب کہ اس مہینے کا فرض عام ایام کے ستر فرضوں کے برابر ثواب کا حامل ہے۔

اور یہ بات عام ایام رمضان کی ہے، اگر لیلۃ القدر کے ثواب اور اجر کا جائزہ لیں تو بات کئی ہزار گناہ تک جا پہنچتی ہے، اس ایک مثال سے اس ماہ مبارک کی برکتوں کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس کی برکات کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

۴۔ یہ مہینہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد میں بھی ہم سے سرگرمی کے مظاہرے کی امید کرتا ہے، اور اس پہلو پر بھی ہماری توجہ دلاتا ہے، ہم کہ عام ایام مین اگر عبادات کو ادا کر بھی لیتے ہیں تو حقوق العباد عام طور پر ہماری توجہ سے محروم رہتے ہیں، یہ صورتِ حال ہمارے ایمان کی کم زوری کی علامت ہے، اس لیے یہ ماہِ صیام ہمیں اس حوالے سے بھی اپنی کم زوریوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کا ایک موقع عطا کرتا ہے، اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کی طرح محض چند رسمی عبادات کا مجموعہ نہیں، اس کا پورا نظام ہے، جس

میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کو مکمل اعتدال کے ساتھ بالکل بیلنس کر کے رکھا گیا ہے۔

۵۔اس مہینے میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات کو پروان چڑھانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہمارے آس پاس اور دائیں بائیں کسی نوعیت کی احتیاج اور ضرورتیں رکھنے والے افراد تو نہیں ہیں؟ جن کی خاموش اور خفیہ مدد کر کے اپنا رمضان کام یاب بنا سکیں۔ یاد رکھیے کسی مستحق کے ساتھ خیر خواہی ہمارے ایمان کا تقاضا، ہماری ذمے داری کا حصہ، رمضان المبارک کا ہم سے ایک اہم مطالبہ اور خود ہماری ایک ضرورت ہے، اور اس کے لیے نہ کسی تنظیم کی ضرورت ہے، نہ پروپیگنڈے کی، نہ تشہیری ذرائع کی، ضرورت صرف سوز و گداز دل اور اپنی ذمے داریوں کو پہچاننے کی ہے، پھر اس مقصد کے لیے کسی لمبے چوڑے سرمائے کی بھی حاجت نہیں، اپنی گنجائش میں رہتے ہوئے محدود بل کہ محدود ترین سرمائے سے بھی یہ کام ہوسکتا ہے۔

اس خطبۂ مبارکہ میں اس جانب اشارہ فرمایا گیا کہ پانی کے ایک گھونٹ پر کسی کو افطار کرا دینا بھی باعث اجر وثواب ہے، اس کا مفہوم یہ نہیں کہ خود تو انواع اقسام کی لذتوں سے محظوظ ہوں اور مستحقوں کو پانی کا گلاس پکڑا کر فخر محسوس کریں، یہ حکم اس وقت ہے جب کوئی اور چیز میسر نہ ہو۔

۶۔انسان جب کوئی چھوٹا سا نیک کام بھی کرتا ہے تو اس کی فطرت اس کا تذکرہ چاہتی ہے، یہ تذکرہ بعض اوقات احسان جتانے کی حدود میں بھی داخل ہو جاتا ہے، جو فریق ثانی کے دلی تکدر اور ذہنی اذیت کا باعث بنتا ہے، اس لیے اس سے بھی منع فرما دیا گیا، اور فرمایا کہ ہر نیک کام سے مقصود ذاتی تشہیر نہیں ہونی چاہیے، بل کہ نیت خالص اللہ کی رضا کے حصول کی ہونی چاہیے، تب ہی ان نعمتوں کے حق دار بنو گے، جن کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔

۷۔اس مہینے میں ہم نے تجدید ایمان بھی کرنا ہے، تجدیدِ ایمان کا مفہوم ہے اپنی وفاداریوں کو چیک کرنا اور خود احتسابی سے اپنے آپ کو گزار کر دیکھنا کہ اگر ہم زبان سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کر رہے ہیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمارا عمل کس حد تک ہمارے ان دعوں کی تصدیق کرتا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ دعوے ادھورے ہوں، یا ہمارا عمل خود ہمارے دعووں کی تکذیب کر رہا ہو، اور اگر

بالفرض ماضی میں ہم اس کوتاہی کا شکار رہے ہیں تو اب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک موقع عطا کیا ہے، جس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے ایمان کو ازسرِنو تازہ کریں اور اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔

۸۔ دعا مومن کا ہتھیار ہے، اس سے بھی اس ماہ مبارک میں بڑھ چڑھ کر کام لینا ہے، ہمیں ہر طرح کی فلاح اور خیر اللہ سے مانگنی ہے، خصوصاً جنت کا سوال کرنا ہے، جو ہمارا مقصدِ اصلی اور مسکنِ اصلی ہے، اور دوزخ کے عذاب سے اللہ کی پناہ طلب کرنی ہے، کہ وہی مومن کی امیدوں کو قائم رکھنے والا، ان کی دعاؤں کو قبول کرنے والا اور انہیں ہر طرح کی فلاح اور کامیابیاں عطا کرنے والا ہے۔

کتابیات

* آلوسی، ابوالفضل شہاب الدین سید محمود۔ روح المعانی۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ ۱۹۸۵ء
* ابن ابی شیبہ۔ المصنف۔ مکتبۃ الرشد، ریاض۔ ۱۴۰۹ھ
* ابن حجر العسقلانی۔ فتح الباری۔ قدیمی کتب خانہ، کراچی
* ابن خزیمہ، محمد بن اسحاق۔ الصحیح۔ بیروت، المکتب الاسلامی، ۱۹۷۰ء
* ابن کثیر، ابوالفدا عماد الدین۔ التفسیر۔ مصطفی البابی الحلبی، مصر
* ابن کثیر۔ السیرۃ النبویہ۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت
* ابنِ سعد۔ الطبقات الکبریٰ۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ ۱۹۹۷ء
* ابنِ ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید۔ السنن۔ دار المعرفہ، بیروت۔ ۱۹۹۸ء
* ابنِ ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء
* ابوداؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی۔ السنن۔ دار الفکر، بیروت۔ ۱۹۹۴ء
* احمد بن حنبل۔ المسند۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۳ء
* بخاری۔ الصحیح۔ مصطفی البابی الحلبی، مصر۔ ۱۹۵۳ء
* بیہقی۔ شعب الایمان۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ ۱۹۹۰ء
* بیہقی، ابوبکر احمد بن حسین۔ السنن الکبریٰ۔ دار الفکر، بیروت۔ ۱۹۹۶ء

* ترمذی۔ الشمائل النبویۃ۔ دارالفکر بیروت۔ ۱۹۹۴ء
* ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ۔ الجامع السنن۔ دارالفکر بیروت۔ ۱۹۹۴ء
* جاحظ۔ البیان والتبیین۔ دارومکتبۃ الہلال، بیروت۔ ۱۹۹۲ء
* حاکم، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ۔ المستدرک۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ ۹۹۰
* مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی۔ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ مکتبہ رحمانیہ، لاہور
* حلبی، علی بن برہان الدین (م ۱۰۴۴ھ)۔ انسان العیون۔ بیروت، دارالمعرفہ
* حمیدی، ابوبکر عبداللہ بن زبیر۔ المسند۔ کراچی، مجلس علمی، ۱۹۶۳
* ڈاکٹر خالد علوی۔ خلق عظیم۔ دعوۃ اکیڈمی، انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۲ء
* خطیب عمر التبریزی۔ مشکوۃ المصابیح۔ مطبع مجتبائی، دہلی
* خفاجی، احمد شہاب الدین۔ نسیم الریاض۔ ملتان، ادارۂ تالیفات اشرفیہ
* الدارقطنی، علی بن عمر۔ السنن۔ دارنشر الکتب الاسلامیہ، لاہور
* دارمی، عبداللہ بن عبدالرحمن۔ السنن۔ قدیمی کتب خانہ، کراچی
* راغب اصفہانی۔ المفردات۔ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۹۶۱ء
* الرافعی، مصطفیٰ صادق۔ اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویہ۔ بیروت، دارالکتاب العربی ۱۹۹۰
* زرقانی۔ شرح مواہب اللدنیہ۔ دارالمعرفہ، بیروت۔ ۱۹۹۳ء
* سید فضل الرحمن۔ ہادیٔ اعظم۔ زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۱ء
* الشامی، محمد بن یوسف الصالحی۔ سبل الہدیٰ والرشاد۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ ۱۹۹۳ء
* شبلی نعمانی۔ سیرت النبی۔ دارالاشاعت، کراچی
* طبرانی، سلیمان بن احمد۔ المعجم الکبیر۔ المکتبۃ العلوم والحکم، موصل۔ ۱۹۸۳ء
* قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی۔ تفسیر مظہری۔ حیدرآباد دکن
* قاضی عیاض۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قاہرہ، مصطفی بابی الحلبی۔ ۱۹۵۰ء

* مالک بن انس۔ الموطا۔ قدیمی کتب [illegible]
* مسلم، ابوالحسین بن الحجاج۔ الصحیح۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۸ء
* المقریزی، تقی الدین احمد بن علی بن عبدالقادر (م ۸۴۵ھ)۔ امتاع الاسماع۔ بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۹ء
* المنذری۔ الترغیب والترہیب۔ مصر، مصطفی البابی الحلبی، ۱۹۳۳ء
* مولانا محمد ظفر الدین مفتاحی ندوی۔ اسلام کا نظامِ امن۔ ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی۔ ۱۹۹۱ء
* نسائی۔ السنن الکبریٰ۔ بیروت، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۱ء
* مولانا وحیدالدین خان۔ عظمتِ اسلام۔ فضلی سنز، کراچی
* ہیثمی، نورالدین علی بن ابوبکر۔ مجمع الزوائد۔ دارالفکر، بیروت۔ ۱۹۹۴ء

صفحات : ۹۶

- کامیابی کیا ہے۔ کیسے حاصل ہوتی ہے۔
- انسانی زندگی میں نئے راستوں کی اہمیت کیا ہے۔
- احتلاف سے اتفاق کیسے کشید کیا جاسکتا ہے۔
- جذبوں کو مہمیز کیسے ملتی ہے، اور بہت کچھ

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز
اے-۴/۱۸، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی-۷۴۶۰۰ فون: ۳۶۶۸۴۷۹۰
info@rahet.org - www.rahet.org
Zawwar academy publication